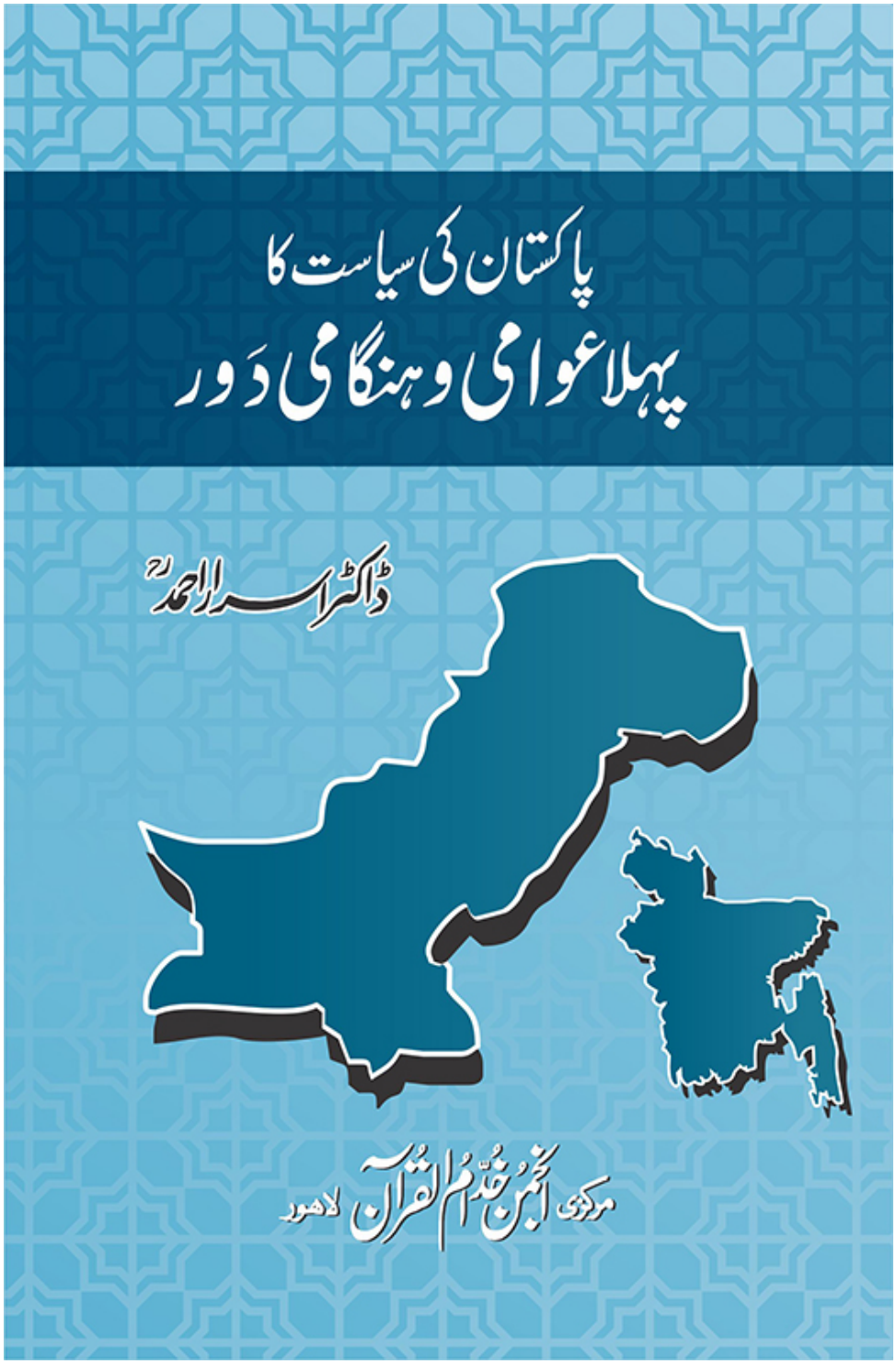


پاکستان کی سیاست کا پہلا عوامی و ہنگامی دَور

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی، و داعیٔ تحریک خلافت پاکستان کے ۶۹ء تا ۷۲ء کے سیاسی تجزیئے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض ناشر

زیر نظر کتاب مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے صدرمؤسس اور تنظیم اسلامی کے امیر' محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ان سیاسی تجزیوں پر مشتمل ہے جو جنوری ۱۹۶۹ء سے فروری۱۹۷۳ء کے دوران ماہنامہ ''میثاق'' کے اداریوں کے طور پر شائع ہوئے۔

ایک دینی انقلابی تحریک کے داعی کا سیاسی امور کے بارے میں رائے زنی کرنا اگرچہ بظاہر کچھ عجیب اور کسی قدر ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے لیکن ہمیں قوی امید ہے کہ اس بارے میں امیر تنظیم کے نقطہ نگاہ سے اکثر احباب بخوبی آگاہ ہوں گے۔ اپنی کتاب ''استحکام پاکستان''میں محترم ڈاکٹر صاحب نے اس ضمن میں اپنا مستقل موقف نہایت وضاحت اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کتاب کے مقدمے میں انہوں نے اس صراحت کے بعد کہ

''میرے بارے میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے اور خود میں نے بھی اس کا بارہا اظہار کیا ہے کہ میں معروف معنی اور مروجہ مفہوم کے اعتبار سے ہرگز ایک سیاسی آدمی نہیں ہوں ''اپنی تحریر و تقریر میں ملکی حالات پر گفتگو اور سیاسی امور پر رائے زنی کا سبب بایں الفاظ بیان فرمایا:

''اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ''سیاست'' اگرچہ فی الاصل ایک نہایت وسیع مفہوم کی حامل اصطلاح ہے لیکن پوری دنیا میں بالعموم اور ہمارے یہاں بالخصوص اس کا ایک ہی محدود مفہوم رائج ہے' یعنی انتخابات میں حصہ لے کر حکومت کے حصول یا اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ پوری دنیا میں یہ امر مسلم ہے کہ صحافت سیاست کا اہم ترین شعبہ ہے' اس لیے کہ یہ رائے عامہ کو ایک خاص رخ پر ہموار کرتی ہے جس کا براہ راست اثر انتخابات پر پڑتا ہے' تاہم مروجہ معنی میں صحافیوں کو سیاسی آدمی کہیں بھی قرار نہیں دیا جاتا۔ اس اشکال کو اس طرح بآسانی حل کیا سکتا ہے کہ سیاست کو دو شعبوں میں منقسم سمجھا جائے۔ ایک نظری یا

5

بالواسطہ سیاست اور دوسرے عملی یا براہ راست سیاست۔ ان میں جہاں تک مؤخر الذکر یعنی عملی سیاست کا تعلق ہے اس نے عہد حاضر اور بالخصوص مغربی ممالک میں ایک پیشہ (profession) کی حیثیت اختیار کرلی ہے' لہٰذا یہ ہر شخص کے کرنے کا کام نہیں بلکہ صرف پیشہ ور سیاستدانوں کی جولان گاہ ہے۔ البتہ جہاں تک مقدم الذکر یعنی نظری سیاست کا تعلق ہے تو کم از کم نظری اعتبار سے یہ ہر باشعور انسان کے لیے لازمی ہے' اس لیے کہ ملک اور قوم کے معاملات پر غور و فکر اور ان کو درپیش مسائل کے لیے سوچ بچار اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے دامے' درمے' سخنے کوشش ہر باشعور شہری کا فرض عین ہے اور اس سے اغماض و اعراض یقیناً ملک اور قوم سے بد عہدی اور بے وفائی کے مترادف ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ کسی انقلابی جماعت کے کارکنوں کے لیے جہاں دینی و اخلاقی تربیت کا اہتمام ضروری ہوتا ہے وہاں ان کی سیاسی تربیت یعنی ملکی سیاسی حالات کا واضح شعور' کارفرما سیاسی قوتوں کے پس منظر اور شجرۂ نسب کا صحیح صحیح ادراک بھی ایک ناگزیر ضرورت ہوتا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ' کے زیر ادارت ماہنامہ ''میثاق''کی اشاعت کا آغاز تو اگرچہ ۱۹۶۶ء کے وسط میں ہوگیا تھا جسے بجا طور پر تحریک رجوع الی القرآن کے ایک مؤثر آرگن کی حیثیت حاصل تھی جس کی کوکھ سے ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی برآمد ہوئی' تاہم میثاق میں سیاسی تجزیوں پر مشتمل اداریوں کی اشاعت کا آغاز ۱۹۶۷ء سے ہوا۔ ان اداریوں میں امیر تنظیم نے تحریک پاکستان کے سیاسی پس منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اس بارے میں اپنا نقطہ نظر بصراحت بیان کیا۔ پھر ۱۹۶۸ء میں بھی جب سابق صدر ایوب خان کا تخت حکومت ڈانواں ڈول تھا' ملک کی سیاسی صورت حال کے بارے میں امیر تنظیم کے متعدد پر مغز اداریئے ماہنامہ میثاق

لی زینت بنے۔ ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۸ء کے دوران شائع ہونے والے یہ سیاسی تجزیئے اب ''اسلام اور پاکستان''نامی کتاب کی صورت میں دستیاب ہیں۔

پاکستانی سیاست کے نئے دور کا آغاز ۱۹۶۹ء میں ہوا۔ ایوب خان کے اقتدار کے خاتمے کے ایک طویل مدت بعد مختلف سیاسی رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں کو قسمت

آزمانے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ اس دور میں بھی امیر تنظیم نے تسلسل کے ساتھ ''یثاق'' کے لیے سیاسی تجزیے تحریر کیے اور میدان سیاست میں باہم نبرد آزما مختلف کرداروں کے پس منظر اور ملکی سیاست میں ان کے حقیقی کردار کو عمدگی سے واضح کیا۔ پاکستانی سیاست کے اس دور کا اختتام ایک نہایت تلخ اور ذلت آمیز قومی سانحے یعنی سقوط مشرقی پاکستان پر ہوا۔ امیر تنظیم نے حالات کی سنگینی کا ادراک کرتے ہوئے بہت پہلے یعنی ۱۹۶۹ء میں اس بارے میں انتباہ کردیا تھا اور حالات جس رخ پر جا رہے تھے اس کی نشاندہی کردی تھی۔ انہوں نے جولائی ۱۹۶۹ء میں قومی سیاسی قیادت کو مشورہ دیا تھا کہ فوجی قوت اور جبرو تشدد کے بل پر مشرقی پاکستان کو اپنے ساتھ جوڑے رکھنے کے بجائے وہاں کے عوام سے استصواب کرایا جائے اور انہیں یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں کہ آیا وہ حسب سابق پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا آزاد اور خود مختار حیثیت کے خواہاں ہیں۔ جولائی ۱۹۶۹ء کے اداریئے میں امیر تنظیم نے اُس وقت ملک میں موجود سیاسی خلفشار کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے اصل اسباب کا تعین کرنے کے بعد اس پیچیدہ صورت حال کا جو حقیقت پسندانہ حل تجویز کیا تھا'اسے اُس وقت تو ہمارے اہل سیاست و صحافت نے قطعاً در خور اعتناء نہ سمجھا بلکہ صورت حال کا مواجہہ کرنے کی بجائے قوم کو لوریاں دے کر سلاتے اور ''محبت کا زمزمہ بہہ رہا ہے ''کی نوید سناتے رہے' لیکن آج محترم ڈاکٹر صاحب کے اس تجزیئے اور مشورے کی اصابت کا ہر کسی کو اعتراف کرنا پڑتا ہے (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب ہذا میں شامل جولائی ۱۹۶۹ء کا اداریہ)۔ زیر نظر کتاب میں انہی سیاسی تجزیوں کو ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔

ان ۲۷ برسوں کے دوران اگرچہ وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ چکا ہے'کمیونزم اور USSR کی موت کے بعد عالمی حالات میں بڑی تبدیلی واقع ہوچکی ہے' پاکستان کی داخلی سیاست میں بھی بائیں بازو کے نمایاں سیاسی گروپ اب زیر زمین جا چکے ہیں'چنانچہ پیپلز پارٹی بھی اب اپنے سابقہ نظریات میں سے اکثر سے اس حد تک تائب ہوچکی ہے کہ اسے بائیں بازو کی سیاسی جماعت قرار دینا اب کسی طور مناسب معلوم نہیں ہوتا'تاہم ملکی سیاست کے میدان میں آج بھی بہت سے کردار وہی ہیں جو آج سے ستائیس اٹھائیس

برس پہلے برسرِ عمل بلکہ برسرِپیکار تھے۔ ان کرداروں کے پس منظر کو جاننے اور ملکی سیاست میں ان کے رول کو سمجھنے کے لیے زیر نظر کتاب میں شامل مضامین ایک کلید کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین ان مضامین کو دلچسپ اور مفید پائیں گے۔

عاکف سعید
ناظم مکتبہ
مرکزی انجمن خدم القرآن لاہور
یکم ستمبر ۱۹۹۶ء

باب اول

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا زوال

اور ذوالفقار علی بھٹو کے

سیاسی کیریئر کا آغاز

--------(۱)-------

جنوری ۱۹۶۹ء

اب سے ڈھائی تین ماہ قبل پاکستان کی سیاسی فضا میں جو زبردست طوفانی ہلچل پیدا ہوئی تھی' اس کا زور تو اگرچہ اب کم ہوگیا ہے اور دوبارہ کچھ ویسی ہی سکون آمیز کیفیت سیاسی میدان پر طاری ہوگئی ہے جیسی کسی بڑے طوفانِ بادو باراں کے بعد فضا پر طاری ہوتی ہے (۱)

تاہم اس طوفان نے سیاسی میدان کے بہت سے گوشوں کو نکھار دیا ہے اور بہت سے زیر سطح رجحانات کو سطح پر لاکر نمایاں کردیا ہے۔ ''یثاق'' اگرچہ ملکی سیاسیات سے بالعموم زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا' تاہم اس وقت جو

صورت حال سامنے ہے اس سے بالکل صرفِ نظر بھی ممکن نہیں۔ بنا بریں ہم بعض مسائل و معاملات کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

میدانِ سیاست کی اس حالیہ سرگرمی کی ابتدا کچھ تو واقعتاً طوفانی انداز کی تھی اور کچھ اس بنا پر بہت زیادہ طوفانی محسوس ہوئی کہ ایک عرصے سے ہمارے ملک میں سیاست کے میدان پر قبرستان کی سی خاموشی طاری تھی... ورنہ ظاہر ہے کہ ہر آزاد ملک میں کچھ نہ کچھ سیاسی سرگرمی تو ہر وقت ہی جاری رہتی ہے' جو انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں بھی کبھی کبھی طوفانی انداز اختیار کرلیتی ہے (جیسا کہ حال ہی میں فرانس میں ہوا تھا)۔ رہے درمیانی درجے کے ممالک تو ان میں تو اکثر و بیشتر سیاست چلتی ہی اس انداز پر ہے' مثلاً ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان میں سال بھر کے دوران شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب اس کے کسی نہ کسی حصے میں بالکل اسی طرح کی صورت حال موجود نہ رہتی ہو _____ (۱) اگرچہ کچھ نہیں کہا جا سکتا ' عین ممکن ہے کہ یہ سکوت و سکون کسی دوسرے طوفان کا پیش خیمہ ہی ثابت ہو !

جیسی ہمارے یہاں اس طوفان کے ابتدائی دنوں میں تھی ۔ ہمارے یہاں چونکہ ایک طویل عرصے کے تعطل کے بعد سیاسی سرگرمی کا آغاز ہوا تھا لہٰذا کچھ تو یہ فی نفسہٖ تیز و تند (rash) تھی اور کچھ انتظامیہ بھی اس کے لیے تیار نہ تھی۔ چنانچہ اس کی جانب سے صورت حال سے عہدہ برآ ہونے میں شدید غلطیاں ہوئیں۔ نتیجتاً آگ مزید بھڑکی اور کچھ ایسا سماں بندھا کہ ایک بار تو بالکل ایسے محسوس ہوا جیسے صدر ایوب کی حکومت خاتمے پر ہے اور پاکستان فوری طور پر کسی نئی سیاسی و انتظامی صورت حال سے دو چار ہونے والا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ صورت حال سنبھل گئی ۔ چنانچہ ایک طرف کچھ تو ایجی ٹیشن کا زور مدھم پڑا اور کچھ حکام سنبھلے' اور دوسری طرف کچھ اپوزیشن کی اپنی صفوں کے بعض رخنے منظر عام پر آئے اور کچھ حکومت کی اعلیٰ ترین سطح کی جانب سے بھی سیاسی گفتگو پر آمادگی کا اظہار ہوا۔ نتیجتاً حالات و واقعات نے کسی فوری اور ہنگامی معاملے کی بجائے مسلسل اور مستقل سیاسی سرگرمی کی صورت اختیار کرلی !

ہمارے نزدیک سیاسی میدان کی یہ سرگرمی بجائے خود ملک و ملت کے حق میں ایک فال نیک ہے۔ قبرستان کی سی خاموشی یا جیل کا سا ''سب اچھا !'' حکمرانوں کے نقطہ نظر سے چاہے کتنا ہی خوش آئند ہو' کسی آزاد ملک اور زندہ قوم کے حق میں زہر ہلاہل سے کسی طرح کم نہیں۔

ہمارے نزدیک عوام کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملکی و ملی مسائل سے بھرپور دلچسپی لیں اور اپنے بھلے اور برے کے بارے میں خود سوچیں۔ اپنے ملک کے انتظامی معاملات کا فیصلہ اور اپنی قومی پالیسیوں کے رخ کا تعین عوام کا حق ہی نہیں فرض ہے... اور خاص طور پر پاکستان ایسے زیر ترقی ملک میں تو اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے

کہ عوام انتظامیہ پر نہ صرف یہ کہ کڑی نظر رکھیں بلکہ اسے پوری طرح لگام دے کر رکھیں ورنہ سیاسیات کے اس مشہور و معروف اصول کے مطابق کہ ''اختیار و اقتدار میں بے راہ روی کا رجحان فطری طور پر موجود ہوتا ہے اور اقتدارِ مطلق تو لازماً بے راہ ہوکر رہتا ہے !'' (۲)
ایک بے لگام اور بگٹٹ انتظامیہ کا بے راہ اورکج رو ہونا قطعی و یقینی ہے ! _____

(۲)"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely"

قیام پاکستان کے ابتدائی دس سالوں میں ملکی سیاست کے بازار میں خاصی رونق رہی تھی اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ''پارلیمانی سیاست'' کی گہما گہمی اور حالات کی تبدیلی اور واقعات و حوادث کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا تھا... اگرچہ مضبوط اور محکم سیاسی جماعتوں کے فقدان کے باعث میدانِ سیاست کی یہ ساری گرما گرمی خیر کے بجائے شر پیدا کرتی چلی گئی ،جس کا منطقی نتیجہ ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہم نے مئی ۱۹۶۷ء میں ان ہی صفحات میں ۱۹۵۸ء کے اس فوجی انقلاب کی نوعیت ،اس کے اسباب و علل اور عواقب ونتائج کے بارے میں جو رائے پیش کی تھی وہ حسب ذیل ہے:

''میدانِ سیاست کے اس اختلال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر رفتہ رفتہ سروسز کے جانب منتقل ہوتی چلی گئی ، تاآنکہ ۱۹۵۸ء میں صدر ایوب نے تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے کر فوجی حکومت قائم کردی اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر ایک طرف حکومت کا پورا نظم و نسق کلیۃً سروسز کے حوالے کردیا اور دوسری طرف بنیادی جمہوریت کے نظام کے ذریعے سیاسی حقوق اور اختیارات کو تدریجاً عوام کے جانب منتقل کرنے کا وہی سلسلہ ازسر نو شروع کیا جس پر تقریباً نصف صدی قبل غیر ملکی حکمران عمل پیرا ہوئے تھے۔ گویا پاکستان کی عوامی سیاست ایک دم واپس نصف صدی قبل کے مقام پر پہنچ گئی ! ملی اور قومی نقطۂ نگاہ سے یہ صورتِ حال یقیناًنہایت تشویش ناک اور پریشان کن ہے اور ہر مخلص اور محب وطن پاکستانی کو لازماً اس پر سخت مضطرب اور غمگین ہونا چاہیے... لیکن اس حقیقت کو ہر آن پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس کا اصل سبب قوم میں سیاسی شعور کی خطرناک حد تک کمی اور ملی و قومی احساسات کا خوف ناک حد تک فقدان ہے ! کسی ایک یا چند افراد کے سر اس پوری صورت حال کی ذمہ داری تھوپ دینا یا سیاسی بے بصیرتی کا شاہکار ہے یا علمی خیانت کا !''

بہرحال مارشل لاء کے نافذ ہوتے ہی فطری طور پر ملکی سیاست کا بازار ایک دم بند ہوگیا اور تمام سیاسی حلقے موت و زیست کی کش مکش سے دوچار ہوگئے۔

مارشل لاء تو ہمارے ملک میں اگرچہ چند ہی سال جاری رہا اور چاہے کسی کو پاکستان کے موجودہ دستور سے کتنا ہی

اختلاف کیوں نہ ہو بہرحال یہ ایک واقعہ ہے کہ ۱۹۶۲ء سے ہمارے ملک میں ایک باقاعدہ دستوری حکومت قائم ہے

11

لیکن بالکل ایسے جیسے حضرت سلیمان ؑ کی وفات کے بعد بھی ایک عرصے تک جنوں اور شیطانوں پر ان کی ہیبت و وحشت کے اثرات قائم رہے تھے‘ ہمارے سیاسیئین کو بھی مارشل لاء کے صدمے سے ہوش میں آنے میں کافی وقت لگا اور مارشل لاء کے خاتمے کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک ملکی سیاست کے میدان میں مکمل سرد بازاری کا سماں طاری رہا !

یہ واقعہ ہے کہ مارشل لاء کے صدمے سے سب سے پہلے ہوش میں آنے والی جماعت‘جماعت اسلامی تھی‘جو سیاسی جماعتوں پر سے پابندی اٹھ جانے کے فوراً بعد ایک منظم جماعت کی حیثیت سے برسرکار ہوگئی ... اور یہ اس لیے ممکن ہوسکا کہ اس کے کارکنوں نے مارشل لاء کے دوران بھی کسی نہ کسی صورت میں اپنی اجتماعیت کو برقرار رکھا تھا۔ دوسرے نمبر پر حرکت میں آنے والا گروپ نظامِ اسلام کا تھا۔ مسلم لیگ کے احیاء کی کوشش ہوئی تو وہ فوراً سرکاری اور مخالف ِسرکار دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ رہے پاکستان کے اکثر قدیم‘خاندانی اور پیشہ ور سیاست دان تو ان کی اکثریت صورت حال کو کچھ زیادہ امید افزا نہ پاکر بدستور گوشہ عافیت میں دبکی رہی۔

۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے موقع پر ۱۹۵۸ء کے بعد پہلی مرتبہ ملکی سیاست کے میدان میں کچھ ہلچل پیدا ہوئی‘ اور محترمہ فاطمہ جناح کی ہمت و جرأت نے مارشل لاء کے عصائے سلیمانی کو دیمک کی طرح چٹ کرلیا۔ تب سیاسی سورماؤں کو ہوش آیا اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ لیکن اب وقت کم تھا اور صدر ایوب کی سیاسی حکمت عملی نے انتخابات کو ملتوی کرنے سے انکار کرکے ''احزاب'' مخالف کے ہاتھوں سے موقع چھین لیا !

اس موقع پر مخالف احزاب نے ''COP'' کے نام سے جو متحدہ محاذ قائم کیا تھا اس کے پاس عوام کو اپیل کرنے کے لیے آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کے قیام کا بھاری بھرکم نعرہ تھا۔ لیکن تجزیے سے جو بات سامنے آتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ صدارتی طرز حکومت کے بجائے پارلیمانی طرز کا احیاء مطلوب تھا اور بس۔ اس مطالبے اور اس کے لیے متحدہ محاذوں کے قیام کے بارے میں ہماری پختہ رائے وہی ہے جو ہم نے مئی ۱۹۶۷ء کے متذکرہ بالا تذکرہ و تبصرہ میں عرض کی تھی‘یعنی یہ :

12

''ساتھ ہی یہ موٹی سی بات بھی ہر مخلص پاکستانی کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اس کا علاج نہ صدارتی اور پارلیمانی جمہوریت یا بلا واسطہ و بالواسطہ انتخابات کے مسئلوں پر وقتی ہنگامے اٹھانے سے ہوسکتا ہے‘نہ مینڈکوں کی پنیری کی طرح کے بالکل انمل بے جوڑ متحدہ محاذوں کے قیام سے ! اس صورت حال کی اصلاح کی صرف ایک صورت ہے

اور وہ یہ کہ بالکل فطری طریق پر عوام میں سے کوئی سیاسی جماعت ایسی اٹھے جو مسلسل محنت و مشقت اور پیہم جدوجہد کے ذریعے ایک طرف ان میں سیاسی شعور اور اپنے بھلے اور برے کی حقیقی پہچان پیدا کرے اور دوسری طرف ایک بڑی تعداد میں ایسے قومی کارکنوں کو تربیت دے کر تیار کرے جو ہر طرح کے مفادات سے صرف نظر کرکے خالص اصولوں کے لیے کام کرسکیں اور اپنے مقصد اور نصب العین کے ساتھ مخلصانہ تعلق اور قوم کی بہتری اور بھلائی کے لیے انتھک محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کی صلاحیت رکھتے ہوں!''

۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے بعد کے چار سالوں کے بعض حالات و واقعات کا تذکرہ ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال کے صحیح تجزیے اور ان مختلف عوامل کے صحیح فہم کے لیے ناگزیر ہے جو اس وقت ملک کی سیاسی فضا میں برسرِکار ہیں:

(۱) ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے دوران جو زلزلہ سا صدر ایوب کے ایوانِ اقتدار میں محترمہ فاطمہ جناح کی شرکت کے باعث آگیا تھا' اس سے خبردار ہوکر صدر ایوب نے اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے اور اس غرض کے لیے اپنی جماعت کو مضبوط بنیادوں پر ازسرنو منظم کرنے کی جانب توجہ کی اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے لیے انہوں نے سرتوڑ کوشش کی۔ چنانچہ ابتدائی زمانے میں جبکہ احزاب اختلاف ابھی کچھ تو اپنی انتخابی شکست کے زخم چاٹنے میں مصروف تھیں اور کچھ باہم دست و گریباں بھی ہوگئی تھیں' کنونشن لیگ کی تنظیم نو کا خاصا چرچا ہوا اور کچھ عرصے تک تو یہ محسوس کیا گیا کہ شاید آئندہ اس ملک کی واحد سیاسی تنظیم سرکاری لیگ ہی ہوگی... لیکن جلد ہی یہ بات واضح ہوگئی کہ نہ تو صدر ایوب عوام میں کوئی جذبۂ تازہ پیدا کرسکے اور نہ ہی مخلص اور محنتی کارکنوں کی کوئی ٹیم تیار کرسکے۔ چنانچہ ادھر کچھ عرصے سے صدر ایوب کے قریبی حلقے کے لوگ بھی برملا اعتراف کر رہے ہیں اور غالباً حالیہ سیاسی ہنگاموں کے بعد تو صدر ایوب خود بھی

محسوس کرتے ہوں گے کہ وہ پاکستان مسلم لیگ کو ایک منظم اور فعال عوامی جماعت بنانے کی کوشش میں قطعاً ناکام ہوگئے ہیں اور اس کوشش میں جو وقت اور سرمایہ صرف ہوا وہ اکثر و بیشتر ضائع ہوگیا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں کسی عوامی جدوجہد کے دوران محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کے ذریعے منظم و مستحکم ہوا کرتی ہیں اور مصائب و تکالیف کے الاؤ اور ابتلاؤں اور آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزر کر ہی ان کے کارکنوں کا مِس خام کندن بنتا ہے۔ مسندِ اقتدار تک رسائی کے بعد سے تو فوری طور پر کسی سیاسی جماعت کا زوال شروع ہوجاتا ہے۔ حکومت کے ایوانوں اور اقتدار کی مسندوں پر بیٹھ کر سیاسی جماعتوں کی تنظیم کی کوشش ویسا ہی احمقانہ خیال ہے جیسا یہ منصوبہ کہ پہلے سیدھے یا ٹیڑھے جس راستے سے بھی ممکن ہو اقتدار پر قبضہ جما لیا جائے اور پھر اس کے ذریعے ایک عوامی اسلامی انقلاب برپا کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ کنونشن لیگ سے منسلک لوگوں میں سے اکثر و بیشتر کی اصل نظر مفادات پر ہے اور ان ہی کی باہمی بندر بانٹ پاکستان مسلم لیگ کی اصل اجتماعی سرگرمی ہے' نہ اس کے پاس مخلص کارکن ہیں اور نہ ہی عوام کی پشت پناہی اسے حاصل ہے۔ نتیجتاً صدر ایوب کی حکومت یا تو خود ان کی اپنی ذات کے بل پر قائم ہے یا سروسز کے سہارے' اس کی کوئی حقیقی اور واقعی سیاسی اساس موجود نہیں ہے۔

(۲) ۱۹۶۵ء کی پاک ہند جنگ بلاشبہ گزشتہ صدارتی انتخابات کے بعد کے دور کا اہم ترین واقعہ ہے۔ ملک کے بقا و دفاع اور خاص طور پر اس کی خارجہ حکمت عملی کے اعتبار سے تو اس کی اہمیت اظہر من الشمس ہے' ملک کی داخلی سیاست پر بھی اس کے بہت گہرے اثرات مترتب ہوئے۔ ہمیں یہاں اس سترہ روزہ جنگ کے اسباب و علل سے تو سرے سے کوئی بحث ہی نہیں' اس کے تمام عواقب و نتائج کا استحصاء بھی مطلوب نہیں' البتہ ان میں سے چند ایسے امور کا تذکرہ ناگزیر ہے جن کا براہِ راست تعلق ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال سے ہے۔

* ان میں سے اہم ترین امر تو یہ ہے کہ اس جنگ کے جو نتائج برآمد ہوئے ان کی بناء پر صدر

ایوب کی سیاسی حیثیت کو شدید دھکا لگا اور ان کا جو ستارہ ایشیا کے ایک عظیم رہنما یا بالفاظِ دیگر ایشیائی ڈیگال کی حیثیت میں عروج کی جانب حرکت کر رہا تھا' مائل بہ زوال ہوگیا۔

* دوسرے یہ کہ پاکستان کی خارجہ حکمت عملی جو چند سال قبل سے مسلسل ایک خاص رخ پر بڑھتی چلی جا رہی تھی ایک انتہا پر پہنچ کر نہ صرف یہ کہ رک گئی بلکہ واپس قدیم سمت میں گردش کرنے لگی اور بظاہر احوال بھی اس میں کم از کم اعتدال کا رنگ نمایاں ہوگیا۔

*تیسرے یہ کہ مسلم قومیت کا جو جذبہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب بنا تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد جلد ہی سرد پڑ گیا تھا' اس جنگ کے دوران نہ صرف یہ کہ ایک دم پھر بیدار ہوا بلکہ ایک بار پھر اپنے پورے عروج کو پہنچ گیا' اگرچہ اس کا یہ زور شور (tempo) اب کی بار بھی عارضی ہی ثابت ہوا اور جنگ کے بعد جلد ہی یہ جذبہ پھر سرد پڑنا شروع ہوگیا۔

پاکستان کی خارجہ حکمت عملی اور پاکستانی قومیت دونوں کے اعتبار سے پاکستان کی سیاسیات میں جو مد اس جنگ کے دوران آیا تھا' صدر ایوب کو تو اپنی مخصوص ذمہ دارانہ حیثیت کی مجبوریوں کی بنا پر اسے ایک خاص حد تک لے جانے کے بعد واپس جذر کی جانب لوٹنا پڑا... لیکن ان کے ایک اپنے تربیت دادہ نوجوان ساتھی نے مد سے جذر کی جانب رجوع سے انکار کردیا اور وہ اسی مقام پر کھڑا رہ گیا۔ نتیجتاً اس نے اس مد کے لیے علامتی حیثیت اختیار کرلی۔ بس یہیں سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی اصل ذاتی سیاسی زندگی اور پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایک بالکل نئے باب کا آغاز ہوگیا!

(۳) قدیم سکہ بند احزابِ اختلاف، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے بعد کچھ عرصہ تو کچھ اپنی انتخابی شکست کے زخموں کو سہلانے میں مصروف رہیں اور کچھ باہمی اختلافات میں الجھی رہیں۔ اس کے فوراً بعد ۱۹۶۵ء کی پاک ہند جنگ واقع ہوگئی جس میں پوری قوم متحد اور یکسو تھی اور اختلاف و افتراق کی گنجائش ہی نہ تھی۔ جنگ کے فوراً بعد اعلانِ تاشقند سے انہیں صدر ایوب کی حکومت کے خلاف عوامی جذبات کو مشتعل کرنے کا ایک سنہری موقع ہاتھ آیا تھا اور مخالف جماعتوں کے جوشیلے کارکن اس پر مصر بھی تھے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔

لیکن بعض بزرگ سیاست دانوں نے عوامی ایجی ٹیشن کی تجویز کو رد کر کے ایک پرامن آئینی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، نظام اسلام پارٹی، عوامی لیگ اور مشرقی پاکستان کے قومی جمہوری محاذ پر مشتمل ایک متحدہ محاذ پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ (PDM) کے نام سے معرض وجود میں آگیا، جو تقریباً دو سال سے سہل انداز میں اور سبج چال سے لیکن بڑے تسلسل و استقلال کے ساتھ دھیمے دھیمے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک مسٹر بھٹو نے ہنگامہ کھڑا کر کے اسے بالکل نئی صورت حال سے دوچار کر دیا۔

پی ڈی ایم کو اس بات کا کریڈٹ بہرحال دیا جانا چاہیے کہ اس نے تقریباً دو سال تک بحالیٔ جمہوریت کے لیے بڑی مستقل مزاجی سے کام کیا ہے اور اس کے لیے واقعی اور حقیقی محنت کی ہے۔ اگرچہ وہ جس شائستہ (sophisticated) قسم کے طریق کار کی عادی ہے، اس سے کسی بھی حکومت کو فوری طور پر خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی، کجا کہ ایک ملک کی اپنی نوکر شاہی (beurocracy) کی حکومت کو، جو ایک حقیقی عوامی جمہوری حکومت کے سوائے باقی تمام قسم کی حکومتوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے ... تاہم اس میں شک نہیں کہ کم از کم پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پی ڈی ایم کی حالیہ دو سالہ جدوجہد ایسی منظم اور مسلسل اور آئینی و پر امن جدوجہد کی کوئی دوسری مثال جماعت اسلامی کی ابتدائی دستوری مہموں کے سوا نہیں ملتی۔

اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ پی ڈی ایم کا اصل تنظیمی ڈھانچہ بھی جماعت اسلامی ہی کے سہارے قائم ہے اور اس کی اصل روح رواں بھی جماعت اسلامی ہی ہے۔ پی ڈی ایم میں شامل دوسری تمام جماعتیں اور پارٹیاں چند معروف سیاست دانوں کی باہمی ایسوسی ایشنوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہ اصل جماعتی تنظیم جس کے بل پر پی ڈی ایم کا سارا کاروبار چل رہا ہے، صرف جماعت اسلامی کی ہے۔

پی ڈی ایم کے بارے میں ایک اور اہم بات جو پیش نظر رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس پر دائیں بازو کے رجحانات کا فیصلہ کن غلبہ ہے۔ بائیں رجحانات کے حامل صرف نہایت نرم طبع اور معتدل مزاج لوگ ہی اس میں کھپ سکے ہیں اور انہیں بھی جلد یا بدیر اس سے علیحدگی اختیار کرنی ہوگی ... یہ بات بھی نوٹ

کرنے کے قابل ہے کہ اس اعتبار سے بھی اصل علامتی حیثیت اس گروہ میں جماعت اسلامی ہی کو حاصل ہے۔ اور یہ ‘جیسا کہ ہم بعد میں قدرے تفصیل سے عرض کریں گے’ اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے ایک بہت بڑی بد قسمتی کا آغاز ہے۔

(۴) سوشلسٹ ذہن اور بائیں بازو کے رجحانات مشرقی پاکستان کی حد تک تو کم از کم اتنے ہی ’’قدیم‘‘ ہیں جتنا خود پاکستان ‘لیکن مغربی پاکستان میں یہ رجحانات زیادہ تر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ابھرے ہیں۔ اور گزشتہ دو ڈھائی سال کے عرصے میں ‘اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رجحانات تیزی کے ساتھ پھیلے بھی ہیں اور مختلف تنظیمی ہیئتوں کی شکل میں نمودار بھی ہوئے ہیں۔ اس کا ایک سبب ملک کی معیشت میں ’’صنعتی انقلاب‘‘ کے اثرات بھی ہیں‘جن سے موجودہ استحصالی نظام معیشت کی گھناؤنی صورت کھل کر سامنے آرہی ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بیکاری سے بھی ان رجحانات کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ہماری گزشتہ پانچ چھ سال کی خارجہ پالیسی نے بھی‘جس کے مدّو جذر کے جانب ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں ‘ان رجحانات کو تقویت دی ہے ۔ غرض کہ مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر ہمارے ملک میں سوشلسٹ نظریات اور بائیں بازو کے رجحانات نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی قوت کی صورت اختیار کرلی ہے۔

مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی اس کی ایک عظیم علامت ہیں اور مغربی پاکستان میں یوں تو اس کے کئی ایک دھڑے ہیں لیکن ان کے اصل علامت کی حیثیت بلاشبہ مسٹر بھٹو کو حاصل ہوگئی ہے۔ اگرچہ ان دونوں کے مابین اشتراکِ عمل کی کوئی واضح صورت تاحال سامنے نہیں آئی ‘تاہم یہ ایک یقینی امر ہے کہ عنقریب ان دونوں میں اتحاد کی صورت پیدا ہوجائے گی اور پھر یہ بائیں بازو کا وہ اصل مرکز (nucleus) ہو گا جس کے گرد ملک کے تمام سوشلسٹ عناصر حتیٰ کہ معتدل مزاج (یا عام اخباری اصطلاح کے مطابق ماسکونواز)طبقے بھی جو اس وقت پی ڈی ایم کے ساتھ ہیں ‘جلد یا بدیر جمع ہونے پر مجبور ہوجائیں گے۔

(۵) گزشتہ دو ڈھائی سال کے دوران تدریجاً ایک اور قوت بھی پاکستانی سیاست کے منظر عام پر

نمودار ہوئی ہے۔ ہماری مراد جمعیت علمائے اسلام سے ہے جس نے اس عرصے میں رفتہ رفتہ خاصی قوت بہم پہنچائی ہے اور اپنے منتشر اثرات کو خاصے مضبوط تنظیمی سلسلے میں منسلک کرلیا ہے۔ یہ تنظیم اگرچہ اپنی ہیئت اور نوعیت کے اعتبار سے دوسری تنظیموں مثلاً جماعت اسلامی سے بہت مختلف انداز کی ہے (مثلاً اس کے یہاں کاغذی کارروائی اور دفتری نظام شاید بالکل ہی دقیانوسی اور primitive طرز کا ہو‘لیکن ایک مشترک ذہنی ساخت اور مشترک اندازِ فکر اور اس کے ساتھ ساتھ ایک شاندار ماضی کے ورثے کی بنا پر اس گروہ نے بہت جلد ایک نہایت

منظم اور فعال فطری تنظیم کی صورت اختیار کرلی ہے۔ عوام میں اس کی جڑیں انتہائی زیریں سطحوں (substrata) تک گہری اتری ہوئی ہیں۔ دینی مدارس اس کے مستقبل مراکز اور اللہ کے گھر اس کے مستقل دفاتر ہیں۔ اس کے عام کارکن ہی نہیں اکابر تک سب خالص عوامی کارکن ہیں۔ سادگی' دین داری اور غایت درجہ خلوص کے ساتھ نہایت زور دار جذبۂعمل اس کے شعائر ہیں۔ ان تمام چیزوں کےپیش نظریہ اندازہ قطعاً مبالغہ پر مبنی نہیں ہے کہ آئندہ پاکستان کی سیاست کے میدان میں جمعیت علمائے اسلام نہایت موثر رول ادا کرے گی۔

ہم انہی صفحات میں چند ماہ قبل یہ عرض کرچکے ہیں کہ یہ گروہ ذہناً و قلباً خالص حسینی ہے' یعنی علمائے دیوبند کے اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس کے سرگروہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی ؒ تھے۔ اس طرح ان کا تعلق تحریک آزادی ٔہند و استخلاصِ وطن کے اس قدیم و عظیم سلسلے سے جا ملتا ہے جو تحریک شہیدین سے شروع ہوکر' ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی سے ہوتا ہوا' اور پھر تحریک خلافت اور ریشمی رومالوں کی تحریک ایسی دوسری متعدد چھوٹی چھوٹی کڑیوں سے گزر کر بالآخر جمعیت علمائے ہند پر ختم ہوا تھا اور اس پورے عرصے میں اسلامیانِ ہند کی رہنمائی کا فرض ادا کرتا رہا تھا۔ آزادء ہند سے متصلاً قبل مسلمانان ہند کی ایک عظیم اکثریت نے اس گروہ کے راستے کو چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کرلیا تھا جو بالآخر قیام پاکستان پر منتج ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اول اول اس طبقے پر شکست کا سا احساس طاری رہا' اور ان حضرات نے ایک عرصے تک حلقہ دیوبند کے ان دوسرے اکابر کی سیادت قبول کرکے جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تھا گوشہ عافیت میں پناہ لیے رکھی۔ ۵۳-۱۹۵۲ء میں مجلس احرار اسلام نے جو عظیم سیاسی ایجی ٹیشن برپا کیا تھا' اس کی پشت پر اصل قوت اسی گروہ کی تھی۔ اس کے فوراً بعد جب پاکستانی سیاست میں انتشار برپا ہوا اور مسلم لیگ

کو فیصلہ کن سیاسی حیثیت حاصل نہ رہی تو اس گروہ نے بھی اپنی حامیٔ مسلم لیگ قیادت کا جو اگر دن سے اتار پھینکا اور خالصتاً اپنا اصل اور قدیم رنگ اختیار کرلیا۔

اُس وقت سے اب تک اندر ہی اندر ان کی تنظیم وسعت اختیار کرتی رہی اور اس کے کارکنوں میں جو ش و جذبہ بیدار ہوتا رہا۔ گزشتہ سال ان کی جو کانفرنس لاہور میں موچی دروازے کے باہر ہوئی تھی' اس سے اندازہ ہوگیا تھا کہ جلد ہی جمعیت پاکستان کی عملی سیاست میں مؤثر طور پر دخیل ہوگی... اور واقعہ بھی یہی ہے کہ مارشل لاء کے بعد سے جو سکوت و سکون پاکستانی سیاست پر طاری تھا اور لوگ جس طرح سہمے سہمے سے تھے' اس میں پہلی ہلچل اور اولین سیاسی سرگرمی جمعیت ہی کے زیر اثرپیدا ہوئی۔ ہماری مراد اس کامیاب ایجی ٹیشن سے ہے جو ڈاکٹر فضل الرحمن کی کتاب کے خلاف برپا ہوئی تھی اورجس سے چھٹکارا پانے کے لیے حکومت ِوقت کو ڈاکٹر صاحب موصوف کو قربانی کا بکرا بنانا پڑا تھا !

اس گروہ کے بارے میں اہم ترین بات جو نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہے اور چاہے اس کا سبب مغربی استعمار سے شدید نفرت کا وہ قدیم جذبہ ہو جو انہیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملا ہے اور گویا ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے' چاہے یہ واقعہ ہو کہ چونکہ یہ خود ایک خالص عوامی قوت ہیں لہٰذا عوام کی دقتوں اور مشکلات کا زیادہ قریبی احساس رکھتے ہیں' اور چاہے یہ ہو کہ ماضی میں ان کا اشتراکِ عمل جس عظیم سیاسی تحریک کے ساتھ رہا ہے (ہماری مراد ماضی کی انڈین نیشنل کانگرس ہے) اس پر بالعموم سوشلسٹ خیالات کا غلبہ تھا... سبب یا اسباب خواہ کچھ بھی ہوں بہرحال واقعہ یہی ہے کہ جمعیت علمائے اسلام کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہے ۔ چاہے اس کے اکابر و رہنما خالص اور بے آمیزش اسلام ہی کے علمبردار ہوں' اس کے کارکنوں میں کثیر تعداد ایسے جوشیلے لوگوں کی شامل ہے جو اسلام کے ساتھ سوشلزم کا پیوند نظری طور پر درست اور بحالاتِ موجودہ عملاً لازمی خیال کرتے ہیں !

یہی وجہ ہے کہ شرق اوسط کی سیاست میں بھی یہ حضرات صدر ناصر کے حامی و موید اور شاہ

فیصل کے ناقد و مخالف ہیں' اور تازہ سیاسی ہنگامے میں بھی ان کی شرکت اولاً نیشنل عوامی پارٹی اور بھٹو صاحب کی پاکستان پیپلز پارٹی کے شانہ بشانہ ہوئی ہے۔ اس صورت حال کا صحیح اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انگلستان سے واپسی پر جب مولانا مودودی نے غیر معمولی گھن گرج کے ساتھ سوشلزم کے حامیوں کو چیلنج کیا تو اس کے جواب میں جمعیت علمائے اسلام کے سرکاری آرگن ''ترجمان اسلام'' نے ''مودودی صاحب کی تازہ گھن گرج'' کے عنوان سے تحریر فرمایا :

''لندن کی سرد آب و ہوا سے صحت یاب ہوکر مودودی صاحب پاکستان کے نسبتاً گرم ماحول میں تشریف لا چکے ہیں جس کی گرمی میں کافی اضافہ ان کی غیرحاضری کے دوران کے پیدا شدہ گرم سیاسی موسم نے کر رکھا ہے۔ آپ نے ۳۰ دسمبر کی شام کو لاہور میں مختلف حصوں سے آئے ہوئے اپنی جماعت کے کارکنوں سے زبردست گھن گرج کے عالم میں فرمایا کہ ''جب تک ہم زندہ ہیں اس وقت تک کسی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ یہاں اسلام کے سوا کسی اور نظام کو لا سکے۔'' مودودی صاحب کی یہ گھن گرج اگر اس دعویٰ کی حقیقتاً حامل ہوتی اور اپنے ان فرمودات کے دوسرے حصوں میں خود ہی انہوں نے اپنی اس ''گھن گرج'' کی بالمعنی تردید نہ فرما دی ہوتی تو اس اعلان کا خیر مقدم پاکستان کا ہر دین دار مسلمان تہ دل سے کرتا۔ لیکن اسے کیا کیجیے کہ اس ساری ''گھن گرج'' کا مقصد صرف یہاں پہنچ کر ختم کردیا گیا کہ ''اسلام اور سوشلزم کا پیوند لگانا ممکن نہیں'' اور یہ کہ ''یہ محمد عربی کی امت کا ملک ہے' یہ مارکس یا ماؤزے تنگ کی امت کا ملک نہیں ہے''۔ سوال یہ ہے کہ اسلام اور سوشلزم کے پیوند کا انکار کرنے والا اسلام اور برطانوی پارلیمانی نظام کے پیوند کا بھی انکار کیوں نہیں کرتا؟ اور محمد عربی کی اُمت کے اس

ملک کے مارکس اور ماؤزے تنگ کی اُمت کا ملک ہونے کی نفی کرنے والا اس ملک میں اُس برطانوی سیاسی نظام کی بحالی کی جدوجہد میں کیوں مصروف ہے جو گلیڈ سٹون' لائڈ جارج 'چرچل وغیرہ کا تراشیدہ اور رائج کردہ ہے؟ آخر اسلامی نظام کے قیام کی یہ بلند بانگ صدا صرف سوشلزم ہی کے مقابلہ میں کیوں اتنی ''گھن گرج'' دکھاتی ہے اور کیوں برطانوی پارلیمانی نظام کی حمایت میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ اس نظام کے ہر چھوٹے بڑے جزو کو بھی قبول کرتی چلی جاتی ہے؟'' (ترجمان اسلام: ۱۰ جنوری ۱۹۶۹ء)

الغرض ایک مدت ِطویل کے حبس کے بعد جو طوفانی کیفیت گزشتہ ڈھائی تین ماہ کے دوران پاکستانی سیاست کے میدان پر طاری رہی تھی' اس کے مدھم پڑتے ہی جو نئی صورت حال سامنے آئی ہے اور گزشتہ چند سالوں سے جو رجحانات زیر سطح تقویت پاتے رہے ہیں ان کے ایک دم سطح پر آجانے سے سیاست کی جو تازہ بساط پاکستان میں بچھی ہے' اس کا مختصر نقشہ یہ ہے:

(۱) جہاں تک حکومت وقت کا تعلق ہے 'وہ کچھ ایک فرد کی ذاتی شخصیت کے سہارے اور زیادہ تر نوکر شاہی کے بل پر قائم ہے۔ اس کی عوامی و سیاسی جڑیں اول تو کوئی ہیں ہی نہیں' اور جو ہیں ان کی حیثیت بھی زیادہ سے زیادہ ان اضافی جڑوں (adventitious roots) کی سی ہے جو بعض درختوں (مثلاً بر گد) کی شاخوں سے اُتر کر زمین میں پنجے گاڑ لیتی ہیں اور درخت کے پھیلاؤ کے لیے اضافی سہاروں کا کام دیتی ہیں۔

(۲) پاکستانی سیاست کا وہ دور اب گزر چکا جب سیاست صرف اصحابِ دولت و ثروت کے مشغلے کی حیثیت رکھتی تھی اور گنتی کے چند جاگیردار اور سرمایہ دار (جن میں تازہ اضافہ بعض نو دولتیے صنعت کاروں کا ہوا تھا) اس پر کامل اجارہ داری رکھتے تھے۔ اب یہاں عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہوگیا ہے اور وہ دور قریب آیا چاہتا ہے جس کی خبر علامہ اقبال مرحوم نے اپنے ان اشعار میں دی تھی کہ ؎

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اور ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

(۳) پاکستان کی موجودہ بساطِ سیاست کے عناصر اربعہ یہ ہیں: ایک دائیں بازو کے قدیم خاندانی اور پیشہ ور سیاست دان جو اکثر و بیشتر زمینداروں اور سرمایہ داروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اگرچہ اس وقت متعدد سرکاری و غیر سرکاری لیگوں میں منقسم ہیں لیکن در حقیقت ملت واحد ہیں اور اور کسی بھی وقت ع ''آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک'' کے مصداق باہم متحد ہوسکتے ہیں (کنونشن لیگ اور کونسل لیگ تو خالص ہم جنس ہیں ہی، عوامی لیگ میں البتہ لیگی الاصل عناصر کے ساتھ بعض حقیقی عوامی عناصر بھی شامل ہیں، لیکن سیاست کی موجودہ تیز رفتاری کے پیش نظر ان کا جلد ایک دوسرے سے علیحدہ ہوجانا قطعی ہے)۔ دوسرے، دائیں بازو

کی مضبوط مذہبی جماعت ... جماعت اسلامی۔ تیسرے، بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں جن میں سے کچھ فی الوقت پی ڈی ایم (یا تازہ تر ڈی اے سی) میں شامل ہیں اور کچھ اس کے باہر ہیں۔ چوتھے، بائیں بازو کی مذہبی جماعت ... جمعیت علمائے اسلام۔(۳)

(۴) پاکستان کی آئندہ سیاسیات کا اصل محور (axis) دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کا تصادم ہوگا(۴) اور متذکرہ بالا موجودہ بساطِ سیاست میں جو گروہ بندیاں اس محور کے علاوہ کسی اور بنیاد پر قائم ہیں یا ابھی قائم ہو رہی ہیں وہ جلد یا بدیر ٹوٹ کر رہیں گی اور نئی صف بندی (alignment) اسی محور کے گرد ہوگی۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ قابل حذر لیکن قطعاً یقینی امر یہ ہے کہ دائیں اور بائیں بازو کی بیرونی قوتیں بھی اب پاکستانی سیاست میں پہلے سے کہیں زیادہ دخیل ہوں گی اور اپنے اپنے مفادات کے تحفظ اور اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کے دفاع اور ان میں توسیع کے لیے زیادہ سے زیادہ امکانی حد تک اثر انداز ہونے کی کوشش کریں گی۔

(۵) ہمارے نزدیک اس وقت ملک کی داخلی سیاست کے اصل بنیادی مسائل دو ہیں۔ ایک یہ کہ سیاسی اختیارات جو مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر عوام کے بجائے نوکر شاہی کے قبضے میں چلے گئے ہیں، وہ اختیار و اقتدار کے اصل مالکوں یعنی جمہور کو منتقل کیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ دولت اور خصوصاً ذرائع پیداوار جو عوام الناس کے بجائے ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری بن گئے ہیں انہیں پوری قوم میں عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کیا جائے۔ گویا کہ پہلی ''سلطانیٔ جمہور'' _____ (۳) رہے بعض وہ ''تازہ واردانِ'' بساطِ سیاست جو آزاد سیاست دانوں کی حیثیت سے دنگل میں شریک ہوئے ہیں تو اس سے قطع نظر کہ ہمارے نزدیک ان حضرات کی کوئی واقعی سیاسی اہمیت نہیں ہے اور ان میں سے بعض کا جو شاندار استقبال ہوا ہے وہ بھی ہمارے نزدیک پاکستانی قوم کے ایک طبقے کے سیاسی افلاس کا مظہر ہے، چونکہ وہ تقریباً سب کے سب دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہم انہیں میدانِ سیاست کا پانچواں سوار بھی تسلیم نہیں کرتے بلکہ متذکرۃ الصدر عناصر اربعہ میں سے پہلے عنصر ہی کا ضمیمہ سمجھتے ہیں!

(۴) جس کی ایک ناخوشگوار ابتداء لاہور اور کراچی میں دائیں بازو کی انتہائی جماعت جماعت اسلامی اور بائیں بازو کے انتہا پسند لوگ یعنی پی پی پی کے کارکنوں کے سر پھٹول کی شکل میں ہو چکی ہے۔

کے نظام کے واقعی اور حقیقی نفاذ کی کوشش ہے اور دوسری ''دورِ سرمایہ داری'' کے منحوس اثرات اور نقوشِ کہن کو مٹانے کی سعی و جہد ہے۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں ہی کوششیں درست بھی ہیں اور مبارک بھی' اور ملک کے ہر ذی شعور شہری کا فرض ہے کہ وہ ان میں اپنی صلاحیت' استعداد اور قوتِ کار کے مطابق حصہ لے۔ اسلام کے نزدیک یہ دونوں ہی مقاصد محمود ہیں۔ اسلام ایک طرف اسے بھی گوارا نہیں کرتا کہ بندگانِ خدا کی گردنوں پر کوئی ایک فرد یا کچھ افراد یا کوئی مخصوص طبقہ خدائی کا تخت جما کر بیٹھے... اور دوسری طرف عدل وانصاف پر بھی انتہائی زور دیتا ہے۔ چنانچہ {وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ؕ}(۵)

آنحضور ﷺ کے فرائض منصبی میں سے ہے اور {لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ}(۶)

کتابِ الٰہی کا مقصد نزول ہے اور {دُوْلَۃًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ ؕ}(۷)

کی کوئی صورت اسلام کے نزدیک کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں!

لیکن افسوس کہ ہمارے یہاں اس وقت ان دونوں ہی میں شدید افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے۔ دائیں بازو کے اہل سیاست نے صرف پہلے کام پر نگاہوں کو مرکوز کر دیا ہے اور دوسرے معاملے کے ضمن میں وہ ''وعدۂ فردا'' سے آگے قدم بڑھانے کو تیار نہیں' اور مزید بد قسمتی یہ کہ ''سلطانی جمہور'' کے ذیل میں بھی ان کے سارے تصورات یورپ کے مبنی بر الحاد فکر سے مستعار لیے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بائیں بازو کے حامی لوگوں نے اپنی اصل توجہ دوسرے کام پر مرکوز کر دی ہے اور ''عدل اجتماعی'' کے لیے نظام بھی ان کے پیش نظر خدا تعالیٰ اور رسول ﷺ کا عطا کردہ نہیں' بلکہ مارکس' لینن اور ماؤزے تنگ کا وضع کردہ ہے!!

(۵) ''اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے مابین انصاف کروں۔'' (الشوریٰ:۳۸)

(٦) ''تاکہ لوگ عدل و انصاف کے نظام پر قائم رہیں'' (الحدید:۲۵)

(۷) ''(سرمائے کا) اُلٹ پھیر تمہارے اہل ثروت ہی کے مابین۔'' (الحشر:۷)

اس صورت حال میں ہر اس شخص کے لیے جو اول و آخر صرف مسلمان ہو اور جس کے نزدیک دین ومذہب ہر چیز پر مقدم ہوں' ایک اہم لمحہ فکریہ ہے۔ ایسے سب لوگوں کو خواہ وہ موجودہ سیاسی سرگرمی میں کسی حیثیت سے شریک

ہوں خواہ کسی خالص غیر سیاسی کام میں مصروف ہوں' اس صورت حال کا بنظر غائر مطالعہ کرنا چاہیے اور آئندہ پیش آنے والے حالات کے مدنظر دین کے احیاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے مناسب لائحہ عمل طے کر کے اس پر عمل پیرا ہوجانا چاہیے۔ ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

--------(۲)--------

فروری ۱۹۶۹ء

گزشتہ ماہ کا ''تذکرہ و تبصرہ'' ہم نے اس نسبتاً پرسکون وقفے کے دوران تحریر کیا تھا جو پاکستانی سیاست کے میدان میں پہلی طوفانی ہلچل کے بعد کچھ دنوں کے لیے آیا تھا۔ اور اگرچہ ہم نے اس وقت کی سکون آمیز کیفیت کے بارے میں اس خدشے کا اظہار بھی کردیا تھا کہ ''عین ممکن ہے کہ یہ سکوت و سکون کسی دوسرے طوفان کا پیش خیمہ ہی ثابت ہو'' تاہم واقعہ یہ ہے کہ ہمیں قطعاً اندازہ نہ تھا کہ اس قدر فوری طور پر ایک دوسرا طوفان آجائے گا جس کی تیزی و تندی سابقہ تمام ریکارڈ توڑ ڈالے گی۔

بہرحال 'متوقع یا غیر متوقع 'طوفان کا یہ دوسرا ریلا تھا بہت سخت 'جس میں معاملہ جلسوں 'جلوسوں 'مظاہروں 'لاٹھی چارج اور اشک آور گیس کے استعمال سے بہت آگے نکل کر عوام کی طرف سے توڑ پھوڑ 'لوٹ مار 'آتش زنی و خشت باری بلکہ بعض مقامات پر مہلک ہتھیاروں کے استعمال تک ... اور حکومت کی جانب سے پولیس کی فائرنگ 'فوج کی طلبی اور کرفیو کے نفاذ تک جا پہنچا۔ چنانچہ مشرقی و مغربی پاکستان کے درجن بھر بڑے بڑے شہروں میں مسلسل کئی روز تک لاقانونیت کا دور دورہ رہا اور شہری زندگی پر کامل تعطل کی کیفیت طاری رہی ... اور اگرچہ ان سطور

کی تحریر کے وقت صورتحال یہ ہے کہ بالعموم حالات پر قابو پایا جا چکا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ فوج کی آمد اور کرفیو کے نفاذ کے بعد کسی جگہ سے بھی کسی خاص واقعے یا حادثے کی اطلاع نہیں ملی 'چنانچہ اکثر مقامات سے کرفیو اٹھایا بھی جا چکا ہے 'تاہم حالات کسی طرح بھی اطمینان بخش قرار نہیں دیے جا سکتے اور عین ممکن ہے کہ کچھ وقفے کے بعد دوبارہ ناخوشگوار واقعات کا سلسلہ شروع ہوجائے۔

ہم نے گزشتہ ماہ بھی عرض کیا تھا 'اور پھر اعادتاً عرض ہے کہ ہمیں ملک کی سیاست سے براہِ راست کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ ع ''ہر کسے را بہر کارے ساختند'' کے مصداق

ہمارا مزاج ہی سیاست سے موافقت نہ رکھتا ہو اور ہم اپنی افتادِ طبع کے باعث اس سے بعد محسوس کرتے ہوں۔

لیکن جہاں تک ہماری شعوری سوچ کا تعلق ہے' اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمیں اصل دلچسپی دین و مذہب سے ہے اور ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ اگرچہ ہماری ملکی سیاست کے میدان میں مسلسل دین و مذہب کا نام لیا جاتا رہا ہے اور اس وقت بھی دو مضبوط مذہبی گروہ پاکستانی سیاسیات میں برسرکار ہیں' حقیقت یہ ہے کہ نہ ہماری موجودہ ملکی سیاست کا کوئی تعلق اسلام سے ہے اور نہ ہی گزشتہ اکیس سال کے دوران کبھی دین و مذہب کو پاکستان کی سیاست میں کسی موثر عامل کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

بایں ہمہ چونکہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ انسان اپنے گردوپیش سے بالکل لاتعلق نہیں رہ سکتا اور ملک و ملت کے مسائل تو بہت اہم ہیں' گلی اور محلے کے معاملات سے بھی کسی انسان کے لیے قطعاً لاتعلق رہنا ممکن نہیں' لہٰذا گزشتہ ماہ بھی ہم نے ملک کی موجودہ سیاسی صورتحال کا اپنے نقطہ نظر سے تجزیہ کیا تھا اور اپنے فہم کی حد تک موجودہ سیاست کے حدود اربعہ کے تعین کی کوشش کی تھی... اور اس ماہ بھی ہم اپنی رائے' جو خالصتاً ملک و ملت کی خیر خواہی اور قوم و وطن کی نصح و ہمدردی پر مبنی ہے' پیش کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاست سخت تشویش ناک صورت اختیار کر گئی ہے اور ملک و ملت کے تمام بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ جماعتی سیاست کے تقاضوں سے بلند تر ہو کر خالص ملی و قومی سطح پر غور و فکر کریں اور اس پیچیدہ صورت حال کو جلد از جلد سلجھانے کی کوشش کریں۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ سیاسی ایجی ٹیشن کے اس دوسرے ریلے میں لاقانونیت اور انارکی کا رنگ غالب تھا۔ اگرچہ تمام مخالف جماعتوں نے تخریبی سرگرمیوں کی ذمہ داری سے اظہارِ براءت کیا ہے اور توڑ پھوڑ اور لوٹ مار کی ساری ذمہ داری کسی قدر غنڈہ عناصر پر اور زیادہ تر حکام کے غلط اقدامات پر ڈالی ہے اور یہ الزام بھی لگایا ہے کہ یہ ساری کارروائی حکام نے سخت تر اقدامات کا جواز مہیا کرنے کے لیے ازخود اپنے ایجنٹوں سے کرائی ہے' تاہم یہ بالکل واضح ہے کہ عوامی سطح پر سیاسی شعور اور جماعتی تنظیم کی ابھی ہمارے یہاں بہت کمی ہے اور اپوزیشن کسی طرح بھی اس امر کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ قوم کی ایک ایسی واضح اکثریت کا اعتماد و تعاون اسے حاصل ہے کہ وہ اپنی سیاسی تحریک کو طے کردہ خطوط پر چلانے اور اسے کوئی غلط رُخ اختیار کرنے سے روکنے پر قادر ہے۔

آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے ایک مرتبہ اپنی سیاسی تحریک کو عین عروج کے موقع پر محض اس بنا پر ایک دم بند کر دیا تھا کہ ایک مشتعل ہجوم نے ایک تھانے پر حملہ کر دیا تھا اور اس کے باوجود کہ ان کے تمام اہم رفقاء اس پر سخت برہم ہوئے تھے اور مصر تھے کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے لیں' وہ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے تھے۔ گویا

ان کا موقف یہ تھا کہ ایسے واقعات کا ظہور ہماری سیاسی پوزیشن کی کمزوری اور عوام پر ہماری گرفت کی کمی کا ثبوت ہے ‘اور ہمیں ابھی ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

کے مصداق عوامی تحریک چلانے سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی توجہات عوام کے سیاسی شعور کی تربیت اور عوامی تنظیم کے استحکام پر مرکوز کردینی چاہئیں۔

ہمارے یہاں ‘جیسا کہ ہم نے گزشتہ ماہ بھی عرض کیا تھا‘اس وقت عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہورہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ بالکل شروع ہی سے سیاست کے میدان میں صحت

مند روایات قائم ہوتی چلی جائیں اور مختلف الخیال عناصر اپنی اصل توجہ رائے عامہ کو بیدار کرنے اور اپنی جماعتی تنظیم کو مستحکم کرنے پر صرف کریں۔ ہلڑ بازی اور ہنگامہ آرائی میں کسی کی بھی خیر نہیں ہے اور تخریبی سرگرمیوں سے موجودہ حکومت ہی کو پریشانی نہیں ہوگی بلکہ اگر یہ عادت پختہ ہوگئی تو آئندہ بھی ہر حکومت کو مسلسل دقت کا سامنا رہے گا۔ ہمارا سیاسی شعور ابھی بہت کچھ پختگی کا محتاج ہے اور اس نیم خام اور نیم پختہ حالت میں اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ تمام محب وطن اور محب قوم عناصر پوری طرح ہوشیار رہیں‘ مبادا ملک و ملت کے دشمن انارکی کے پردے میں قوم و وطن کو کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوجائیں۔

خاص طور پر طلبہ کا مسئلہ اس وقت نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر گیا ہے۔ ان میں عام بے چینی اور اضطراب کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کے بہت سے اسباب ہیں‘اور یہ مسئلہ صرف ہمارے ملک کا ہی نہیں پوری دنیا کا ہے۔ تہذیب جدید نے انسان کو روحانی قدروں سے جس طرح بیگانہ کیا ہے اور اخلاقی معیارات جتنی تیزی سے پست ہوئے ہیں اس کا مظہر اتم بہرحال نوجوان نسل ہی کو ہونا چاہیے اور کسی اعلیٰ نصب العین کے فقدان کے باعث جو مہیب خلا انسانی زندگی میں پیدا ہوگیا ہے اس کا سب سے نمایاں اثر بھی نوجوان طلبہ ہی میں نظر آنا چاہیے۔ ان پیچ در پیچ اسباب کی بنا پر پوری دنیا میں نوجوان طلبہ کے طبقے کی کیفیت بالکل بارود کی سی ہے جو ذرا سی چنگاری سے بھڑک اٹھنے کو تیار ہوتا ہے۔ پھر خاص طور پر زیر ترقی ممالک کے اپنے مخصوص مسائل ہیں جن سے طلبہ کی بے چینی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں بھی یہ طبقہ ع ’’دیوانہ را ہوئے بس است‘‘ کے مصداق گویا منتظر ہی تھا کہ کہیں سے کوئی صورت ایجی ٹیشن کی پیدا ہو اور یہ اس میں کود پڑیں۔

گزشتہ چند سالوں کے دوران ہماری حکومت نے طلبہ کی سیاسی سرگرمیوں پر جو پابندیاں عائد کیے رکھی ہیں

ان سے بھی ان کے اندر ہی اندر ایک لاوا پکتا رہا ہے جسے بہرحال ایک نہ ایک پھٹنا تھا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ حالیہ سیاسی ایجی ٹیشن میں اصل زور شور طلبہ ہی کا پیدا کردہ ہے اور موجودہ سیاسی ہماہمی ان ہی کی رہین منت ہے۔ تین ماہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا کہ یونیورسٹیاں اور کالج بند ہیں اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ قطعاً معطل پڑا ہے۔ اور اب بھی اگرچہ کچھ کالج کھل گئے ہیں ‘بہت

سے طالب علم کلاسوں کا بائیکاٹ کر رہے ہیں اور اس کے باوجود کہ ان کے کچھ مطالبات تسلیم بھی کیے جا چکے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حکومت نے گویا ان کے آگے گھٹنے ٹیک دیے ہیں لیکن ان کا ایجی ٹیشن علیٰ حالہٖ قائم ہے اور نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی کمی نہیں آ رہی بلکہ ان کے مطالبات میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے... حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کے طلبہ نے تو اپنے مطالبات میں تمام سیاسی طبقات کے جملہ مطالبات کو شامل کر لیا ہے۔

یہ صورتحال بھی متقاضی ہے کہ ملک و ملت کے بہی خواہ اس پر اپنے اپنے جماعتی و گروہی نقطہ ہائے نظر سے نہیں بلکہ قومی و ملی نقطہ نظر سے سوچیں۔ جو سیاسی حلقے طلبہ کو اپنے پیش نظر سیاسی انقلاب کے لیے استعمال کرنے کی کوشش میں ہیں‘ وہ در حقیقت آگ سے کھیل رہے ہیں اور انہیں کسی طرح قوم اور وطن کا بہی خواہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سیاست اصلاً ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو تعلیم سے فارغ ہو کر ملک کے ذمہ دار شہریوں کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ طلبہ کا اصل کام یہ ہے کہ اپنے زمانہ ٔتعلیم میں آئندہ زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی زیادہ سے زیادہ استعداد پیدا کریں۔ اسی تعلیم و تربیت کا ایک جزو یقیناً سیاسی شعور اور ملکی وقومی مسائل کی سوجھ بوجھ بھی ہے‘ لیکن دوران تعلیم کسی سیاسی دھڑے کا آلہ کار بننا طلبہ کے لیے اپنے مستقبل کے اعتبار سے بھی نقسان دہ ہے اور ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبار سے بھی سخت مضر ہے۔

اس تازہ ایجی ٹیشن پر صدر ایوب کا رد عمل ہمارے نزدیک بہت صائب اور متوازن ہے۔ ان کے لیے ایک راستہ یہ بھی تھا کہ موجودہ صورتحال کو صرف ’’بعض شر پسند لوگوں ‘‘کی جانب منسوب کر کے تشدد کی راہ اختیار کر لیتے ۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو بہرحال حکومت کی قوت اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی ہی۔ لیکن اس کے بجائے اپوزیشن کے ساتھ دستوری مسائل پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کر کے انہوں نے یقینا دانش مندی کا ثبوت دیا ہے جس کی ہمارے نزدیک قدر کی جانی چاہیے۔

دوسری طرف یہ پیچیدگی بھی صاف محسوس ہو رہی ہے کہ اپوزیشن نے اب تک جو موقف اختیار کیے رکھا ہے اور جس نہج پر اپنی سیاسی تحریک کو چلایا ہے‘ اس کے پیش نظر اس کے کسی بھی

عنصر کے لیے اس وقت حکومت کے ساتھ سیاسی گفت و شنید کی راہ اختیار کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں سے تو ظاہر ہے کہ اس وقت کسی گفتگو کا کوئی امکان ہی نہیں' انہیں تو اب اس ملک کی سیاست میں حقیقی اور واقعی اپوزیشن کا کردار ادا کرنا ہے۔ معاملہ جو بھی ہوسکتا ہے' دائیں بازو کے ان عناصر ہی سے ہوسکتا ہے جو ڈی اے سی اور صحیح تر الفاظ میں پی ڈی ایم میں شریک ہیں۔ لہٰذا پہلا خطرہ تو یہی ہے کہ مفاہمت کی ادنیٰ ترین کوششوں کو بھی بائیں بازو کی جماعتیں عوامی جدوجہد سے فرار اور عوامی مفادات سے غداری کے نام سے اچھالیں گی۔ پھر پی ڈی ایم خود کوئی ایک سیاسی جماعت نہیں بلکہ کئی سیاسی جتھوں کا مجموعہ ہے' مفاہمت کی گفتگو کے شروع ہوتے ہی ان کے باہم ایک دوسرے سے الجھ جانے کا امکان بھی خارج از بحث نہیں۔ گویا چند در چند وجوہ کی بنا پر صدر ایوب سے مفاہمت کی گفتگو فی الوقت ان لوگوں کے لیے بھی بہت مشکل ہوگئی ہے جن کا صدر ایوب اور حکمران پارٹی سے نظریات کا کوئی اختلاف نہیں اور جنہیں بعض فروعی دستوری معاملات کے ذیل میں اپنے بعض مطالبات منوا کر منطق کے ہر اصول کے مطابق موجودہ حکمران گروہ کے ساتھ ع ''آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک''کی سی کیفیت سے بغل گیر ہوجانا چاہیے۔

تاہم یہ وقت کا ایک اہم تقاضا ہے' جو ہماری رائے میں مشکلات اور موانع کے باوجود پورا ہوگا... اور انتشار' لاقانونیت اور انارکی کے خطرات اور خصوصاً طالب علموں کی موجودہ صورتحال کے پیش نظر' ہمارے نزدیک فی الوقت ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبار سے یہی مناسب اور صحیح تر بھی ہے۔

اس مقصد کے لیے اس وقت خاص طور پر ایسے لوگوں کو میدان میں آنا چاہیے جو تحریک مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ رہے تھے' لیکن بعد میں مختلف اسباب کی بنا پر میدان سیاست سے ہٹتے اور گوشہ گیر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ اس وقت نہ کونسل لیگ سے وابستہ ہیں نہ کنونشن لیگ سے۔ متحدہ ہندوستان جب انگریز کی غلامی سے نجات پانے کی جدوجہد میں مصروف تھا تو بارہا ایسا ہوتا تھا کہ جب حکومتِ وقت اور تحریک آزادی کی علمبردار جماعتوں کے مابین کسی مسئلے پر ڈیڈ لاک ہوجاتا تھا تو کچھ ایسے لوگ حرکت میں آتے تھے جو اپنی نرم طبیعت اور دھیمے مزاج کی بنا پر سرکار دربار میں بھی رسائی رکھتے تھے لیکن ساتھ ہی مخلص محب وطن بھی تھے۔ ایسے لوگ اگرچہ نہ تاریخ تحریکِ

آزادی میں کسی نمایاں حیثیت کے مالک ہیں نہ ہی عوام نے انہیں کبھی اپنا ہیرو تسلیم کیا۔ تاہم اصحاب فہم و بصیرت جانتے ہیں کہ حصولِ آزادی کی جدوجہد میں انہوں نے بھی ایک مثبت کردار ادا کیا ہے۔ ہماری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ ہماری ملکی سیاست کی موجودہ پیچیدہ صورتحال بھی کچھ ایسے ہی لوگوں کے ناخن تدبیر سے سلجھ سکتی ہے... اور اگر ایسے لوگ اس مرحلے پر سامنے نہ آئے تو اندیشہ ہے کہ صورتحال پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی جائے گی اور انتشار بڑھتا چلا جائے گا جس سے پاکستان کا وجود تک خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

یہ تو ہے موجودہ پیچیدہ صورتحال کا فوری حل... باقی جہاں تک پاکستان کی موجودہ سیاست کے مستقل خطوط کا معاملہ ہے اس کے ضمن میں جو تجزیہ ہم نے گزشتہ ماہ ان صفحات میں پیش کیا تھا' ہمیں خوشی ہے کہ قارئین یشاق نے بھی بالعموم اس سے اتفاق کا اظہار کیا اور بعد کے بعض حالات و واقعات سے بھی ان کی مجموعی حیثیت سے تائید و توثیق ہوئی۔

یہ بات اب مزید واضح ہوگئی ہے کہ آئندہ اس ملک کی سیاست کا اصل محور دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کا تصادم ہوگا۔ موجودہ حکومت بھی واضح طور پر دائیں بازو کی جانب جھک چکی ہے اور پی ڈی ایم کے اکثر عناصر بھی واضح طور پر اسی نقطہ نظر کے حامل ہیں۔ گویا پی ڈی ایم اس وقت حقیقی و واقعی اپوزیشن نہیں' مصنوعی اپوزیشن ہے جس کا موجودہ حکومت سے اصل اختلاف نظریات پر نہیں ذاتیات پر مبنی ہے جس پر بعض فروعی دستوری اختلافات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ لہٰذا بساطِ سیاست کے موجودہ نقشے میں بہت جلد تبدیلیاں واقع ہوں گی اور پھر اس ملک کی سیاست کی اصل بساط بچھے گی جو دائیں اور بائیں بازو کی تقسیم پر مبنی ہوگی ۔ یہی وجہ ہے کہ ڈی اے سی کے نام سے جو وسیع تر اتحاد وجود میں آیا تھا وہ مستحکم ہونے سے پہلے ہی بکھرتا نظر آرہا ہے ۔ چنانچہ سابق سندھ کے بعض مقامات پر جب ڈی اے سی کے تحت جلوس نکالنے کی کوشش کی گئی تو بعض نعروں اور کتبوں کی عبارتوں پر شدید اختلاف ہوگیا' اور ڈی سی اے کی صرف چار جماعتیں اس میں شریک ہوسکیں جبکہ بقیہ چار نے علیحدگی اختیار کی۔

دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کے حامل... اور مغربی طرز کی سرمایہ دارانہ جمہوریت

اور سوشلزم و کمیونزم کے حامی عناصر کی اس باہمی ٹکر میں ہمیں اندیشہ ہے کہ اسلام کا نام خوا مخواہ لیا جائے گا جس سے کسی فریق کو تو شاید نہ کوئی نفع پہنچے نہ نقصان' لیکن اسلام کو یقیناً نقصان پہنچے گا۔

حال ہی میں جمعیت علمائے اسلام کی پاکستان میں نشاۃ ثانیہ کے اصل معمار مولانا غلام غوث ہزاروی کے ایک بیان پر جو لے دے ہوئی ہے اس سے یہ بحث زور شور کے ساتھ شروع ہوگئی ہے کہ آیا سوشلزم کا اسلام کے ساتھ پیوند لگ سکتا ہے یا نہیں۔ ہم نے گزشتہ شمارے میں جمعیت کے بارے میں جو تفصیلی رائے پیش کی تھی' مولانا غلام غوث صاحب کے اس بیان سے اس کے اہم ترین جزو کی تصدیق ہوگئی۔ مولانا کے اس بیان کا اصل تعاقب حلقہ دیوبند ہی کے ان علماء کی جانب سے ہوا ہے جنہوں نے ماضی میں تحریک مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا ۔ ان حضرات کی ہمارے دل میں واقعتاً بڑی عزت ہے' لیکن انہوں نے سوشلزم کو اسلام کی عین ضد اور جمہوریت کو عین اسلام ثابت کرنے کے لیے جس قسم کے دلائل دیے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے بھاری بھرکم لوگوں کی جانب سے اور ایسی بچگانہ باتیں!

اسلام بلاشبہ اپنی ذات میں ایک مکمل نظام ہے اور اساسی عقائد و نظریات سے لے کر حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کی تفصیلی تشکیل تک اس کا اپنا ایک منفرد مزاج ہے جو کسی دوسرے نظریئے یا نظام کی پیوند کاری قبول نہیں کرتا۔

چنانچہ نہ اس کے کسی جزو کا پیوند کسی اور نظام کو لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور نظام کے کسی جزو کی پیوند کاری اس کے ساتھ ممکن ہے۔ لیکن اگر اس بنا پر کہ اس کے سیاسی و انتظامی ڈھانچے کے بعض اجزا جمہوریت کے بعض اجزاء سے جزوی مشابہت رکھتے ہیں' اس کا تعلق جمہوریت کے ساتھ قائم کیا جا سکتا ہے تو یقینا اس کے معاشی نظام عدل و قسط کے بھی بعض اجزاء سوشلزم کے بعض اجزاء سے مطابقت رکھتے ہیں اور اس بنا پر اسلام کا رشتہ سوشلزم کے ساتھ بھی ممکن ہے... بلکہ ہمیں یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ خلافت راشدہ میں خلیفہ کی ذات میں اختیارات کا جس قدر ارتکاز تھا اس سے مشابہت کی بنا پر آمریت کا رشتہ بھی اسلام کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔ اسلامی نظامِ معیشت و حکومت کا عروج یقینا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا اور اس میں جہاں جمہوریت کاملہ کے ایسے مظاہر دیکھنے میں آتے تھے کہ ایک عام مسلمان ان کو برسر منبر ٹوک دیتا تھا وہاں ان کے سفر بیت المقدس میں سوشلزم کی بلند ترین منزل کی شان بھی موجود ہے۔

ویسے ہمارے نزدیک' ان دونوں ہی کے ساتھ اسلام کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرنا نرا تکلف ہے۔ ہمارے یہاں نہ حامیانِ جمہوریت' جمہوریت کے داعی اس لیے بنے ہیں کہ انہیں اسلام کی بارگاہ سے اس کا حکم ملا ہے اور نہ ہی سوشلزم کے حامی اس کی جانب اس لیے جھکے ہیں کہ انہیں اسلام کا تقاضا یہی معلوم ہوا۔ یہ سب کچھ تو تاریخ کے ایک عام بہاؤ کے تحت ہو رہا ہے جو گزشتہ دو تین صدیوں سے خالصتاً غیرمذہبی و لادینی رخ پر بہہ رہا ہے اور جس میں مذہب سے سرے سے کوئی بحث (reference) ہی نہیں! حامیانِ دین و مذہب کی اس عام بہاؤ کے زیر اثر پیدا ہونے والے مختلف رجحانات کو بپتسمہ دینے کی کوشش بالکل خوامخواہ ہے!

موٹی سی بات ہے کہ فکر و فلسفے کے اعتبار سے موجودہ پوری دنیا کا امام تاحال یورپ ہے' اور جو خالص بے خدا و مادہ پرستانہ تہذیب وہاں سے اٹھی تھی وہ تاحال پورے کرہ ارضی پر حکمران ہے۔ وہاں کے ازمنہ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (فیوڈل سسٹم) کی کوکھ سے خالص تاریخی عوامل کے زیر اثر جو جمہوری نظام برآمد ہوا تھا' اس نے اولاً سیاسی شعبہ زندگی میں جمہوریت (ڈیموکریسی) کی صورت اختیار کی جس کے مختلف ممالک میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے۔ اسی جمہوریت نے بعد میں معاشی نظام میں آزاد معیشت کی راہ سے سرمایہ داری (کیپٹلزم) کی کریہہ صورت اختیار کرلی' جس کا رد عمل سوشلزم اور کمیونزم کی صورت میں ظاہر ہوا' جو درحقیقت نظریہ و فکر کے اعتبار سے اسی قدیم لادینی مادہ پرستانہ سلسلہ فکر کی اگلی منطقی کڑی اور نظام کے اعتبار سے سرمایہ داری کا قدرتی رد

عمل ہے۔ اس رد عمل کے بھی مختلف ملکوں میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے اور اس میں مادر پدر آزاد معیشت کی تباہ کاریوں کی روک تھام میں انسان نے ایک دوسری انتہا پر پہنچ کر فرد کی آزادی کو بالکل سلب کر کے اسے اجتماعیت کے کاملۂ بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ اس کے باوجود چونکہ اس صورت میں بھی انسان اپنے اوپر کسی اور بالاتر اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا' لہٰذا سوشلزم کے تمام ایڈیشن بھی چاہے وہ روسی ہوں یا چینی' مدعی جمہوریت ہی کے ہیں۔ چنانچہ اس وقت عالمی کمیونسٹ تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ملک بھی ''عوامی جمہوریہ چین''

ہی کہلاتا ہے!

سیاسی و معاشی نظاموں کے انقلابات کا یہ سلسلہ اولاً تو صدی ڈیڑھ صدی میں تکمیل کو پہنچا تھا' لیکن اب دنیا کے تمام زیر ترقی ممالک میں یہ داستان بڑی تیزی کے ساتھ دوہرائی جا رہی ہے اور یہ حالات کا ایک خالصتاً اپنا رخ ہے جو کسی مرحلے پر بھی دین و مذہب سے کوئی فتویٰ طلب نہیں کرتا۔ مفتیانِ دین و مذہب خوا مخواہ اس کے مختلف موڑوں پر اپنے دار الافتاء سے فتوے صادر کرنے کا تکلف کرتے رہتے ہیں۔

پاکستان بھی ایک نیم ترقی یافتہ اور نیم پس ماندہ ملک ہے اور اس میں بسنے والے عوام بھی ایک نیم خوابیدہ و نیم بیدار قوم ہیں۔ اس نیمے دروں و نیمے بروں حالت میں جتنے دوسرے ممالک مبتلا ہیں' عام اس سے کہ وہ مسلمان ہیں یا غیر مسلم' جو کچھ وہاں ہو رہا ہے وہی یہاں ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے... اور ہوتا رہے گا جب تک کہ دین و مذہب اس معاشرے میں واقعتا ایک مؤثر عامل کی حیثیت اختیار نہ کر لیں ... جس کے امکانات بحالاتِ موجودہ دور دور تک نظر نہیں آتے!

ہمارے اس وقت کے جملہ اجتماعی مسائل کی اصل صورت یہ ہے کہ:

(۱) آج سے اکیس سال قبل آزادی کی صورت میں دفعتاً جو سیاسی حقوق و اختیارات ہمارے ہاتھ آئے' ہم بحیثیت قوم اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ اور چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ یہ حقوق و اختیارات عوام کے ہاتھوں تک کبھی پہنچے ہی نہیں۔ بیچ ہی میں کچھ جاگیر داروں (فیوڈل لارڈز) اور کچھ سابق حکمرانوں کی تربیت دادہ سروسز نے انہیں اچک لیا' خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ چونکہ عوام اس کے لیے تیار نہ تھے لہٰذا رفتہ رفتہ یہ اختیارات پہلے چند پیشہ ور سیاست دانوں اور پھر ان کے بھی نا اہل ثابت ہو جانے پر کلیۃً سروسز کو منتقل ہو گئے' دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے اور اس کا رد عمل عوامی جمہوریت کی بحالی یا از سر نو قیام کی کوششوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے!

(۲) آزادی کے وقت ہمارا ملک ایک خالص زرعی ملک تھا اور ان اکیس سالوں کے دوران رفتہ رفتہ صنعت نے ترقی کی' تا آنکہ اب ہم ایک نیم زرعی و نیم صنعتی ملک بن چکے ہیں۔

لیکن چونکہ یہ سارا کام مغرب سے مستعار لیے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے تحت ہوا ہے لہٰذا ہمارے یہاں بھی سرمایہ داری اپنی کریہہ ترین صورت میں ظہور پذیر ہوچکی ہے ۔ چنانچہ ملک کی زرعی دولت پر جو اجارہ داری پہلے سے قائم تھی اس میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ ملک کی پوری صنعت و تجارت پر بھی چند خاندانوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ اس کے رد عمل کے طور پر یہاں بھی وہی کچھ سوچا جا رہا ہے جو دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں سوچا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ تقسیم دولت اور ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت کے پورے نظام کو بیخ و بن سے اکھیڑ ڈالا جائے ۔
ظاہر ہے کہ یہ دونوں رد عمل تاریخ کے متذکرہ بالا عمومی بہاؤ ہی کے اجزا ہیں اور ان میں سے کسی کا بھی کوئی تعلق دین و مذہب سے نہیں !

لیکن چونکہ اتفاقاً ہمارے ملک کے عوام کو مذہب سے ایک جذباتی سا تعلق بھی ہے‘ لہٰذا اس غریب کا نام خوا مخواہ اچھالا جاتا ہے۔ خود تحریک پاکستان کے دوران بھی‘ جس کے اصل اساسی عوامل معاشرتی و معاشی تھے‘ اس کا نام زور شور سے لیا گیا اور پاکستان کا مطلب ہی ’’لا الہ الا اللہ ‘‘بتایا گیا ‘جس کی حقیقت آج روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ربع صدی گزر جانے کے باوجود اس غریب اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتنا ہی نام نشان یہاں نظر آتا ہے جتنا ہندوستان کے مسلمانوں میں‘ بلکہ ہمارے اندازے کے مطابق اس سے بھی کم... اور اب بھی مختلف عمرانی نظریات کے حامل لوگ خوا مخواہ اس کا نام بدنام کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں !

جمعیت علمائے اسلام کا ذکر تو اس وقت رہنے دیجیے‘ اس لیے کہ وہ پاکستانی سیاست کے میدان میں فی الحال نووارد ہے اور ابھی اس کی سیاست کے خطوط بالکل مبہم ہیں۔ چنانچہ وہ کبھی این اے پی اور پی پی پی کے دوش بدوش نظر آتی ہے اور کبھی پی ڈی ایم سے اشتراک کرتی دکھائی دیتی ہے اور کبھی ایک پلڑے میں وزن ڈالتی ہے کبھی دوسرے میں !

البتہ جماعت اسلامی اس لیے قابل ذکر ہے کہ اسے پاکستان کی سیاسیات میں برسر عمل ہوئے پورے اکیس سال بھی ہوچکے ہیں اور اس پورے عرصے میں وہ اس امر کی مدعی بھی رہی ہے کہ اس کا اصل مقصد احیائے اسلام اور اقامت ِدین ہے !

ذرا دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس پورے سفر کے دوران اس کی دینی و مذہبی حیثیت اگر کوئی تھی بھی تو کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوچکی ہے اور وہ تاریخ کے بہاؤ کا رخ موڑنے کی بجائے خود متذکرہ بالا تاریخی بہاؤ کے رخ پر بہہ نکلی ہے... اور اب چاہے ایک مضبوط اور منظم گروہ کی حیثیت سے ملکی سیاست کے میدان میں اس نے اپنا کوئی وقار قائم کر بھی لیا ہو‘ دینی و مذہبی حیثیت سے اس کی سرے سے کوئی اہمیت باقی نہیں رہی !

پاکستانی سیاست کے افق پر اول اول جماعت اسلامی بڑے اعتماد اور ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تحریک پاکستان ہی کے جذباتی پس منظر کو اجاگر کرکے اور ''پاکستان کا مطلب کیا:لا الہ الا اللہ'' کے خالص مسلم لیگی نعرے کو اپنا کر'اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے نام پر وہ انقلابِ قیادت کی مہم تنہا اپنے زورِ بازو کے بل پر بہت جلد سر کرلے گی ۔ چنانچہ اس وقت اگر کسی اور نے اس کو تعاون و اشتراک کی پیشکش بھی کی تو اس نے نہایت حقارت کے ساتھ اس کو ٹھکرا دیا ۔ لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ مسئلہ اتنا آسان نہیں اور تنہا اپنے زورِ بازو سے کام نہیں چل سکے گا تو جماعت نے مذہب ہی کے نام پر علماء اور مذہبی جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی اور ایک عرصے تک جماعت اسلامی کی مذہبی سیاست ''علماء کے متحدہ و متفقہ مطالبات ''کی بنیاد پر چلتی رہی۔

لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد پھر محسوس ہوا کہ چڑھائی بہت سخت ہے اور گاڑی اس سیکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی تو ایک قدم اور نیچے اتر کر خالص ''جمہوریت'' کے نعرے پر سیاست کی نئی بساط بچھائی گئی جس پر تاحال سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے... اور جس کا مظہر کمال یہ ہے کہ ڈی اے سی جس میں پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کے دونوں مذہبی پہلوان اس وقت مجتمع ہیں'اس کے مطالبات اور متفقہ نکات میں غریب اسلام کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں !

خدا شاہد ہے کہ ہمارے پیش نظر کسی جماعت کی تنقیص ہر گز نہیں۔ ان گزارشات سے ہمارا مقصد صرف اپنی اس رائے کی وضاحت ہے کہ موجودہ سیاست کا دین و مذہب سے قطعاً کوئی

تعلق نہیں اور وقت کا جو دھارا خالص غیر مذہبی و لادینی رخ پر بہہ رہا ہے'اس کی مختلف لہروں کی باہمی آویزش میں اسلام کا نام استعمال کرنا اور خاص طور پر اسے موجودہ بوسیدہ'گلے سڑے اور ظالمانہ و استحصالی نظامِ معیشت کا پشت پناہ بنا کر کھڑا کردینا اسلام کی دوستی نہیں'اس کے ساتھ دشمنی ہے ۔تاریخ کے رخ کا جو ''ڈان'' ایک خاص سمت میں بہہ رہا ہے اس کا رخ مذہب کی جانب موڑنے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے فلسفہ و فکر کے میدان میں انقلاب برپا کیا جائے اور روحانی اقدار کا از سر نو احیا ہو' ایمان ویقین کی روشنی دنیا میں پھیلے'اور اخلاق و اعمال میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں۔ جب یہ انقلاب کسی انسانی معاشرے میں ایک معتدبہ حد تک رونما ہوچکے گا تب کہیں جا کر اس کا امکان پیدا ہوگا کہ اس کی سیاست بھی مذہب کے تابع ہو اور وہاں خدا پرستانہ نظامِ زندگی پوری شان کے ساتھ جلوہ آرا ہوسکے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ ہمارا موجودہ پاکستانی معاشرہ ان اعتبارات سے دین و مذہب کی روح سے بہت بعید ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا جن کا اصل تعلق اسلام اور صرف اسلام سے ہو اور جن کی زندگیوں کا مقصود صرف اور صرف احیائے اسلام و اقامت ِدین ہو'موجودہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا اپنی قوتوں'صلاحیتوں اور

اوقات کو ضائع کرنا ہے۔ ان کے لیے ایک ہی راہ کھلی ہے اور وہ یہ کہ... اگر علمی و فکری کام کرنے کی استعداد رکھتے ہوں تو تعلیم و تعلّم قرآن کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیں اور کتاب اللہ کے علم و حکمت کی تحصیل و اشاعت میں مصروف ہوجائیں' اس لیے کہ ایمان و یقین کے احیا کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ... اور اگر علمی کام سے مناسبت نہ رکھتے ہوں تو معاشرے کے کونوں کھدروں میں بیٹھ جائیں اور خلوص و اخلاص کی قوتوں کو بروئے کار لاکر عوام الناس میں دینی و روحانی اقدار کی از سر نو ترویج کی کوشش کریں۔

ہم تحریک پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا'لیکن پاکستان کے معجز نما ظہور... اور دو اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفظ و بقاء ...کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیاء اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور پورے عالم ارضی میں غلبہ اسلام کی خدائی سکیم کی ایک کڑی ضرور ہے۔ اسی بنا پر ہمیں اس کا بقا و وجود بھی عزیز ہے اور اس میں انتشار اور انارکی کسی صورت گوارا نہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس مبارک انقلاب کی ابتداء سیاسی میدان سے نہیں بلکہ علم و فکر اور فلسفہ و حکمت کے میدان سے ہوگی۔ اور

ایک علمی و تعلیمی انقلاب کے سوا اس کی کوئی راہ موجود نہیں ۔اس میدان میں بالکل ابتدائی اور کمیت کے اعتبار سے نہایت حقیر کوشش کیے چلے جانا بھی'چاہے اس کے محسوس نتائج سامنے نہ آئیں'ہمارے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ سیاسی میدان میں بلند بانگ دعاوی کے ساتھ شرکت کی جائے 'لیکن بجائے اس کے رخ کو دین و مذہب کے جانب موڑنے کے خود اس کی رو میں بہہ جایا جائے ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ ہمیں مسلمان جینے اور ایمان پر مرنے کی سعادت نصیب فرمائے۔آمین !

--------(۳)--------

مارچ ۱۹۶۹ء

آج سے دو ماہ قبل'جنوری۱۹۶۹ء کے ''تذکرہ و تبصرہ'' میں ''میثاق '' کے دورِ جدید کے ڈھائی سال کے عرصے میں پہلی بار ملکی سیاسیات پر قلم اٹھایا گیا تھا۔ ''میثاق'' کے تیرہ صفحات پر پھیلی ہوئی اس تحریر میں پاکستان کی موجودہ سیاست کے رجحانات اور ان کے پشت پر کار فرما عوامل کا جو تجزیہ ہم نے اپنے فہم کے مطابق کیا تھا وہ قارئین ''میثاق'' کے حلقے میں تو بالعموم پسند کیا ہی گیا'بعض دوسرے حلقوں کی جانب سے بھی اس کی تائید وتصویب

ہوئی (۱) اور عام طور پر یہ محسوس کیا گیا کہ یہ صورتحال کی واقعی اور حقیقی عکاسی اور مسائل و معاملات کا صحیح و بے لاگ تجزیہ ہے ۔ اس تحریر کی اشاعت کے بعد کے دو ماہ بلاشبہ پاکستانی سیاسیات کی اکیس سالہ تاریخ کا اہم ترین دور ہیں‘جن میں عوامی تحریک ایک طوفان بن کر اٹھی اور ایسی معرکۃ الآراء تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا کوئی تصور بھی چھ ماہ قبل تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس طوفان کے متعدد ریلے گزر جانے کے بعد جو صورتحال سامنے آئی ہے اور پاکستانی سیاست کی سٹیج پر جو تازہ نقشہ جما ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جس کی تصویر ہم نے دو ماہ قبل کی اس تحریر میں کھینچی تھی۔ _____ (۱) چنانچہ ہفت روزہ ''نصرت'' نے جسے اس وقت مسٹر بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کے سرکاری ترجمان کی حیثیت حاصل ہے‘ اپنی اکیسویں اشاعت میں اس پوری تحریر کو نقل کیا۔

گزشتہ دو ماہ کے دوران کی ساری کھینچ تان اور اکھیڑ پچھاڑ اور اتنی مختلف النوع پیش قدمیوں اور پسپائیوں کے بعد جو صورتحال واضح ہوکر سامنے آتی ہے اس کا اس قدر صحیح اور پیشگی اندازہ صرف اسی لیے ممکن ہوسکا کہ ہمارا مطالعہ خالصتاً معروضی تھا اور اس میں ہماری پسند یا ناپسند کو قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔ صورتِ واقعہ جیسی کچھ ہے ‘ہم نے اسے بعینہٖ اسی طرح سمجھنے کی کوشش کی اور بغیر کسی قطع و برید اور کتر بیونت کے جوں کا توں پیش کردیا۔

ہماری گزشتہ ماہ کی پیش کردہ مندرجہ ذیل رائے بھی اگر ذہن میں تازہ کرلی جائے تو جو صورت حال اب درپیش ہے اس کی نقشہ کشی بھی مکمل ہوجائے گی اور اس کے بارے میں ہماری رائے بھی ایک بار پھر واضح ہوجائے گی:

''اس تازہ ایجی ٹیشن پر صدر ایوب کا رد عمل ہمارے نزدیک بہت صائب اور متوازن ہے۔ ان کے لیے ایک راستہ یہ بھی تھا کہ موجودہ صورتحال کو صرف ''بعض شر پسند لوگوں'' کی جانب منسوب کرکے تشدد کی راہ اختیار کرلیتے ۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو بہرحال حکومت کی قوت اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی ہی‘ لیکن اس کے بجائے اپوزیشن کے ساتھ دستوری مسائل پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کرکے انہوں نے یقینا دانش مندی کا ثبوت دیا ہے جس کی ہمارے نزدیک قدر کی جانی چاہیے۔

دوسری طرف یہ پیچیدگی بھی صاف محسوس ہورہی ہے کہ اپوزیشن نے اب تک جو موقف اختیار کیے رکھا ہے اور جس نہج پر اپنی سیاسی تحریک کو چلایا ہے ‘اس کے پیش نظر اس کے کسی بھی عنصر کے لیے اس وقت حکومت کے ساتھ سیاسی گفت و شنید کی راہ اختیار کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں سے تو ظاہر ہے کہ اس وقت کسی گفتگو کا کوئی امکان ہی نہیں‘ انہیں تو اب اس ملک کی سیاست میں حقیقی اور واقعی اپوزیشن کا کردار ادا کرنا ہے۔ معاملہ جو بھی ہوسکتا ہے‘ دائیں بازو کے ان عناصر ہی سے ہوسکتا ہے جو ڈی اے سی اور صحیح تر الفاظ

میں پی ڈی ایم میں شریک ہیں۔ لہٰذا پہلا خطرہ تو یہی ہے کہ مفاہمت کی ادنیٰ ترین کوششوں کو بھی بائیں بازو کی جماعتیں عوامی جدوجہد سے فرار اور عوامی مفادات سے غداری کے نام سے اچھالیں گی۔ پھر پی ڈی ایم خود کوئی ایک سیاسی جماعت نہیں بلکہ کئی سیاسی جتھوں کا مجموعہ ہے۔ مفاہمت کی گفتگو کے شروع ہوتے ہی ان کے باہم ایک دوسرے سے الجھ جانے کا امکان بھی خارج از بحث نہیں۔ گویا چند درچند وجوہ کی بنا پر صدر

ایوب سے مفاہمت کی گفتگو فی الوقت ان لوگوں کے لیے بھی بہت مشکل ہوگئی ہے جن کا صدر ایوب اور حکمران پارٹی سے نظریات کا کوئی اختلاف نہیں اور جنہیں بعض فروعی دستوری معاملات کے ذیل میں اپنے بعض مطالبات منوا کر منطق کے ہر اصول کے مطابق موجودہ حکمران گروہ کے ساتھ ع

''آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک''

کی سی کیفیت سے بغل گیر ہوجانا چاہیے۔

تاہم یہ وقت کا ایک اہم تقاضا ہے جو ہماری رائے میں مشکلات اور موانع کے باوجود پورا ہوگا...اور انتشار'لاقانونیت اور انارکی کے خطرات اور خصوصاً طالب علموں کی موجودہ صورتحال کے پیش نظر'ہمارے نزدیک فی الوقت ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبار سے یہی مناسب اور صحیح تر بھی ہے۔''

وقت کا یہ ''اہم تقاضا'' ہونے کو پورا تو ہوگیا لیکن جو موانع و مشکلات اس کی راہ میں پیش آئی ہیں اور ان کے دوران پاکستان اپنی سیاسی تاریخ کے جس نازک ترین موڑ سے گزرا ہے اس کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہے۔

صدر ایوب کی گفت و شنید کی دعوت نے پوری ڈی اے سی کو بالکل اچانک آلیا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ تو وہ غریب شش وپنج میں مبتلا رہی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ صدر ایوب تو ایک فرد تھے' انہوں نے ایک رخ پر چلے چلتے اچانک اباؤٹ ٹرن کرلیا'لیکن ایک تحریک کی رواں دواں گاڑی کو تو بریک لگاتے لگاتے بھی آخر وقت لگتا ہے۔ دوسری جانب یہ خطرہ بھی واقعی اور حقیقی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر ایک قیادت عوامی تحریک کو بریک لگا کر نیچے اترے اُدھر دوسری قیادت اس کے انجن کو دوبارہ سٹارٹ کرکے لے کر چلتی بنے۔ تیسری طرف یہ معاملہ بھی صاف تھا کہ اب یہ عوامی تحریک اگر مزید آگے بڑھی تو اس کا روکنا مشکل تر ہوجائے گا اور پھر اس کا تمام تر فائدہ بائیں بازو کے لوگوں کے حصے میں آئے گا۔

یہ اسباب و عوامل تھے جن کی بنا پر وہ عمل اندرونی طور پر بڑی تیزی کے ساتھ لیکن ظاہری اعتبار سے بڑی تدریج اور مدھم چال کے ساتھ شروع ہوا جسے اب مسٹر بھٹو بجا طور پر غیر فوجی انقلاب (Civilian Coup de tat) سے تعبیر کر رہے ہیں۔[۲] _____ (۲) عین اس مرحلے پر جبکہ پاکستان اس ''غیر فوجی

انقلاب'' سے گزر رہا ہے' مسٹر آدم ملک وزیر خارجہ انڈونیشیا جہاں کچھ عرصہ قبل ایک باقاعدہ فوجی انقلاب آیا تھا' کا دورئہ پاکستان اور حکومت پاکستان کی طرف سے سہارتو حکومت کے ساتھ تعلقات مزید بڑھانے کی خواہش کا اظہار بہت معنی خیز ہے!

39

مفاہمت اور مصالحت کا یہ عمل بنیادی طور پر تین لوگوں ہی کے مابین ہوا ہے اور اگر کوئی ''عبوری قومی حکومت'' وجود میں آئی 'جس کا امکان بالکل خارج از بحث نہیں 'تو وہ اصلاً ان لیگ ہائے ثلاثہ ہی پر مشتمل ہوگی۔

اس عمل کی مخالفت و مزاحمت بھی' جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا' بائیں بازو کے انتہاپسند لوگوں ہی کی جانب سے ہوئی ۔ مسٹر بھٹو چونکہ ابھی کوئی مستحکم تنظیم نہیں رکھتے اور بدلتے ہوئے حالات نے گویا کم از کم وقتی طور پر تو ان کے پاؤں تلے سے زمین ہی کھینچ لی ہے لہٰذا انہیں محض منفعلانہ مخالفت (passive resistance) پر اکتفا کرنا پڑا۔ لیکن مولانا بھاشانی چونکہ اپنی پشت پر ایک واقعی عوامی سیاسی قوت بھی رکھتے ہیں لہٰذا انہوں نے اس مفاہمت کو برسر میدان للکارا اور بالفعل یہ کوشش کی کہ اب جبکہ ڈی اے سی عوامی تحریک کو بریک لگا رہی ہے وہ خود اس کی قیادت سنبھال کر اپنے پیش نظر انقلاب کی داغ بیل ڈال دیں۔

... اور واقعہ یہ ہے کہ کم از کم مشرقی پاکستان میں اس ''انقلاب'' کی ابتدا ہوگئی تھی۔ فروری ۱۹۶۹ء کی سترہ تاریخ سے اکیس تاریخ تک کے چند دن واقعتاً پاکستان کی تاریخ میں وہ تیسرا نازک موقع تھے جبکہ پاکستان کا وجود سخت خطرے سے دوچار تھا اور اس کی سالمیت سخت مشکوک ہوگئی تھی۔

ہم نے گزشتہ ماہ ان صفحات میں برسبیل تذکرہ عرض کیا تھا کہ: ''ہم تحریک پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا لیکن پاکستان کے معجز نما ظہور... اور دو اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفظ و بقاء ...کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور پورے عالمِ ارضی میں غلبہ اسلام کی خدائی سکیم کی ایک کڑی ضرور ہے! ''تحریک پاکستان کے اساسی محرکات اور پاکستان کے معجز نما قیام کے ضمن میں تو ہم اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ مارچ تا مئی ۱۹۶۷ء کے ''تذکرہ و تبصرہ'' میں ظاہر کر

40

چکے ہیں (یہ مضامین اب ہماری تالیف ''اسلام اور پاکستان'' میں شامل ہیں) ۔رہے وہ دو اہم مواقع جن پر ہمارے نزدیک پاکستان کے وجود و بقا کا تحفظ بالکل معجزانہ طور پر ہوا تو ان میں سے پہلا موقع تو وہ تھا جب صدر ایوب نے اس وقت جبکہ وہ پاکستان کے سیاہ و سفید کے بالکل تنہا مالک تھے' امریکی اثرات کے تحت متحدہ دفاع (joint defence) کی تجویز کی صورت میں گویا پاکستان کو چاندی کی طشتری میں رکھ کر بھارت کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

اسے اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت و مشیت کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ پنڈت نہرو کی عقل اس وقت ماری گئی اور انہوں نے کمال رعونت کے ساتھ صدر ایوب کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔(۳)
اور اس طرح خالصتاً معجزانہ طور پر پاکستان کا مستقل وجود برقرار رہ گیا(۴)
دوسرا موقع ۱۹۶۵ء کی جنگ تھی جس میں پاکستان کا بچ جانا کسی دنیوی حساب کتاب سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اس کی ایک ہی توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی کو پاکستان کا تحفظ و بقا مطلوب ہے !
ہمارے تجزیئے میں ہر اعتبار سے ان دونوں مواقع کے برابر نازک موقع سترہ تا اکیس فروری ۱۹۶۹ء کے چند دن تھے۔ ہمارے نزدیک اگر اس موقع پر صدر ایوب وہ بھاری قیمت ادا نہ کرتے جو انہوں نے اولاً انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کرکے ادا کی جو ایک کھلے اعترافِ شکست کے مترادف تھا' اور پھر اگرتلہ سازش کیس واپس لے کر ادا کی جو داخلی و بین الاقوامی دونوں حیثیتوں سے سخت ذلت آمیز صورت تھی' تو واقعہ یہ ہے کہ کم از کم مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی _____ (۳) یادش بخیر' بالکل اسی مقام سے پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کے ''چین نواز'' دور کا آغاز ایک بالکل ناگزیر ضرورت کے طور پر ہوا تھا۔ راقم نے بارہا نجی گفتگوئوں میں اس صورتحال کو اس تشبیہ سے تعبیر کیا ہے کہ امریکہ کے زیر اثر صدر ایوب نے پنڈت نہرو اور بھارت کے سامنے رکوع تو کر لیا لیکن پنڈت جی شاید اپنے تہذیبی پس منظر کی بنا پر چاہتے تھے کہ وہ باقاعدہ سجدہ کریں جسے ایک مسلمان کا بیٹا گوارا نہ کر سکا۔ چنانچہ بجائے سجدہ کرنے کے صدر ایوب الٹے تن کر کھڑے ہو گئے اور اس کے بعد مسلسل نہ صرف بھارت بلکہ اس کے معنوی سرپرست امریکہ سے بھی دور ہوتے چلے گئے۔ نتیجتاً پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کا جھکاؤ چین کی جانب ہوتا چلا گیا۔
(۴) یاد رہے کہ آنجہانی پنڈت نہرو ہی کی ایک پہلی حماقت کے نتیجے میں پاکستان اپنی موجودہ صورت میں دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا تھا' ورنہ مسلم لیگ نے تو کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر لیا تھا۔ اور اگر کبھی تین خطوں پر مشتمل ''مہابھارت'' ایک بار وجود میں آجاتا تو پھر کسے معلوم کہ پھر کبھی علیحدگی ممکن ہو سکتی یا نہیں !

کے جاری کردہ ''انقلاب'' کو روکنے کی کوئی صورت ممکن نہ تھی !(۵)
اس صورت میں پاکستان کے مشرقی و مغربی خطوں کے حالات ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہوجاتے کہ پھر ان کے ساتھ رہنے کی کوئی صورت ممکن نہ رہتی اور عوامی جمہوریہ چین کی زیر سرپرستی مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال پر مشتمل ایک علیحدہ کمیونسٹ ریاست کے قیام کی راہ ہموار ہوجاتی۔(۶)
ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے پاکستان اور اہل پاکستان پر کہ صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اس موقع پر بالکل گھٹنے ٹیک دینے کی سخت ذلت آمیز کیفیت کو گوارا کر لیا اور اس طرح پاکستان

لی سالمیت کو جو خطرہ لاحق ہوگیا تھا وہ کم از کم فوری طور پر ٹل گیا۔

ہم ایک سے زائد بار اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ ہمارے نزدیک نہ سیاسی جبر و استبداد کے خلاف عوام کی جدوجہد کوئی بری چیز ہے نہ ہی معاشی ظلم و استحصال کے خلاف عوامی تحریک چلانا کسی درجے میں کوئی غلط کام ہے۔ دونوں ہی مقاصد اپنی جگہ درست ہیں' بلکہ ہمیں ان لوگوں کی رائے میں بہت وزن معلوم ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لائے بغیر سیاسی ڈھانچوں میں سطحی اور اوپری تبدیلیوں سے قطعاً کچھ حاصل نہ ہوگا اور نام نہاد جمہوریت بھی اس صورت میں سرمایہ داروں کے گھر کی لونڈی بن کر رہ جائے گی ... لیکن ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ یہ سارے معاملات معروف سیاسی اسلوب و طریق سے طے ہونے چاہئیں اور اس میں نہ تو لاقانونیت اور انارکی کا رنگ پیدا ہونا چاہیے اور نہ ہی انقلابی طریقے اختیار کیے جانے چاہئیں۔

_____ (۵) مولانا بھاشانی کی سیاسی قوت کا جو مظاہرہ اس موقع پر ہوا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ شیخ مجیب الرحمن پیرول پر رہائی کی صورت میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہی نہیں بے تاب تھے۔ لیکن مولانا بھاشانی کی سیاست نے پورے ملک کو تعطل اور گومگو کی کیفیت میں بتلا کیے رکھا تا آنکہ صدر ایوب نے متذکرہ بالا بھاری قیمت ادا کر کے مولانا بھاشانی کو بے بس کر دیا!

(٦) مغربی بنگال کے درمیانی زمانے کے انتخابات کے جو نتائج حال ہی میں سامنے آئے ہیں' ان کے پیش نظر یہ خطرہ خیالی و وہمی نہیں... بالکل حقیقی تھا!

جو لوگ سیاست کے میدان میں ملک و ملت کی مخلصانہ خدمت کرنا چاہتے ہوں انہیں چاہیے کہ محنت و مشقت سے کام کرنے کی عادت ڈالیں' مستقل مزاجی اور عزم و استقلال کے ساتھ اپنے اپنے نظریات کی نشر و اشاعت کریں' اپنے اپنے پروگرام عوام کے سامنے پیش کریں اور اس طرح اپنے حق میں رائے عامہ کو ہموار کریں۔ پھر اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کو مضبوط و محکم تنظیمی سلسلوں میں منسلک کریں اور کھلی سیاسی جدوجہد کے ذریعے ملک کے اجتماعی نظام میں اپنی صوابدید کے مطابق تبدیلیاں برپا کرنے کی کوشش کریں۔ محض ہلڑ بازی اور ہنگامہ آرائی یا وقتی مسائل و معاملات کو نعروں کی صورت میں اچھال کر عارضی شور و غوغا برپا کر دینے سے نہ صرف یہ کہ حاصل کچھ نہ ہوگا بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ کہیں کوئی ناقابل تلافی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اسی طرح انقلابی طریقوں کے اختیار کرنے میں بھی شدید خطرات مضمر ہیں اور بھلائی سے زیادہ برائی کا اندیشہ ہے۔ گویا کہ ان دونوں کی حیثیت ہمارے نزدیک وہی ہے جو قرآن مجید کی رو سے شراب اور قمار کی' یعنی اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔

اس اعتبار سے ہمارے لیے انگریز قوم کی تاریخ میں ایک بڑا اہم سبق ہے۔ اس قوم نے اپنے ملک میں ''رائے عامہ'' کے بروئے کار آنے کے راستوں کو ہمیشہ کھلا رکھا۔ نتیجتاً دنیا میں جتنے انقلاب آئے ان کے بہترین

ثمرات سے بھی یہ متمتع ہوتی رہی لیکن لبھی کوئی انقلابی تبدیلی بھی اس کے یہاں برپا نہیں ہوئی۔ بادشاہت اور جاگیرداری کے خلاف ''انقلاب'' فرانس کی سرزمین پر رونما ہوا اور اس کے لیے فرانسیسی قوم کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ،لیکن اس کے بہترین ثمرات سے انگلستان متمتع ہوا۔ چنانچہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ جمہوریت کی اعلیٰ ترین صورت وہاں قائم ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ علامتی بادشاہت بھی تاحال وہاں موجود ہے اور جاگیرداری نظام کے آثار کو بھی ابھی تک انہوں نے بالکلیہ ختم نہیں کیا۔ اسی طرح کمیونسٹ انقلاب کے لیے خون کی ندیاں دوسرے ممالک میں بہیں لیکن فلاحی ریاست اور کفالت ِعامہ کی خوبصورت ترین صورت کو آزاد معیشت کے ساتھ خوبصورت ترین طریقے پر انگلستان نے نتھی کیا... اور یہ سب کچھ نہایت عمدہ تدریج کے ساتھ بالکل کھلی اور عیاں سیاسی سرگرمی کے نتیجے کے طور پر ہوتا رہا۔

اسی قسم کا ایک تجربہ ہمارے ہمسایہ ملک میں ہو رہا ہے جہاں جملہ معاملات کو سیاست کے میدان میں طے کرنے کے دروازے کھلے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی حتیٰ کہ چین کے حامی

کمیونسٹوں پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ چنانچہ سیاست کے میدان میں اتار چڑھاؤ اور مدوجزر تو آتے رہتے ہیں ،لیکن تاحال کسی ''انقلاب'' سے بھارت کو دو چار ہونا نہیں پڑا۔

ہمارے یہاں بھی خیر اسی میں ہے کہ یہ بات بطورِ اصولِ موضوعہ تسلیم کرلی جائے کہ جملہ معاملات و مسائل کا حل معروف سیاسی وجمہوری طریقوں پر ہوگا اور سب کو یہ حق حاصل ہوگا کہ رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرکے اختیار و اقتدار حاصل کرنے اور مسندِ حکومت پر قبضہ جمانے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ سیاسی میدان کی پابندیوں کو حتی الامکان ختم کردیا جائے اور جذبہ و فکر کے اثر و نفوذ کی تمام راہوں کو حتی الامکان سب کے لیے یکساں کھول دیا جائے ،تاکہ کہیں کسی زیر زمین سرگرمی یا انقلابی طریق کار کی ضرورت کا احساس ہی پیدا نہ ہو۔ اس اعتبار سے ہمارے نزدیک مسٹر بھٹو کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی پر سے بھی پابندی اٹھا لی جانی چاہیے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جذبہ و فکر کی راہوں کو کبھی مسدود نہیں کیا جاسکتا۔ آپ ان کے ایک جانب بند باندھیں گے تو وہ دوسری جانب بہہ نکلیں گے۔ ہمارے حالیہ تجربے سے تو یہ بات بالکل ہی ثابت ہوگئی ہے کہ کسی فکر کو پابند و پابجولاں کرنا ممکن نہیں۔ کمیونسٹ پارٹی پر ہمارے یہاں پابندی عائد رہی ،لیکن کمیونسٹ انقلاب ہمارے نصف بہتر خطے کے عین دروازوں تک پہنچ گیا تھا ! فکر کا مقابلہ جوابی فکر ہی سے کیا جا سکتا ہے اور معاملات و مسائل کا حل ان کا مردانہ وار مواجہہ (face) کرنے ہی سے ممکن ہے۔ مصنوعی پابندیوں اور فراری ذہنیت سے کوئی معرکہ سر نہیں کیا جا سکتا !

ایک دوسری نہایت اہم بات یہ ہے کہ ملکی سیاست کے میدان میں مذہب کا نام نہایت احتیاط کے

ساتھ اور بالکل ناگزیر حد تک ہی لیا جانا چاہیے۔ ہمارے پڑھے لکھے طبقے کا بالعموم مذہبی اعتبار سے جو حال ہے وہ سب ہی کو معلوم ہے اور خود عوام کی ایک عظیم اکثریت میں بنیادی اخلاقی و روحانی اقدار جس سطح پر ہیں وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ جب مذہب اس وقت نہ ہمارے فکر میں سرایت کیے ہوئے ہے نہ جذبے میں تو آخر سیاست کے میدان میں اس کی کارفرمائی کیسے ہوگی؟ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ دین و مذہب کے اعتبار سے میاں ممتاز محمد خان دولتانہ اور سردار شوکت حیات خاں یا شیخ مجیب الرحمن اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے مابین کون سا فرق و تفاوت ہے؟ بلکہ عجیب تر صورت یہ ہے کہ پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کے داعی اعظم مولانا بھاشانی تو علمائے

دیوبند کے صحبت یافتہ اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں اور نظام اسلام پارٹی کے متعدد اہم کارکنوں کے ملی و قومی جذبہ و اخلاص کے معترف ہونے کے باوجود ذاتی طور پر ہمیں معلوم ہے کہ وہ جمعے کی نماز پڑھنے کے بھی روادار نہیں ! مقصود کسی کی تنقیص نہیں بلکہ صرف اس امر کی وضاحت ہے کہ ہمارے ملک میں مذہب بالکل بنیاد سے تعمیر جدید کا محتاج ہے اور احیاء اسلام کی آرزو رکھنے و الے لوگوں کو پہلے فکر کے میدان میں اسلامی انقلاب اور عوامی سطح پر اسلام کی مخصوص اخلاقی و روحانی اقدار کی از سر نو ترویج کا کٹھن اور صبر آزما کام کرنا ہوگا۔ موجود الوقت حالات میں سیاسی میدان میں اسلام کا نعرہ لگانا اور سیاسی و معاشی مسائل میں مختلف نقطہ ہائے نظر کے حامل لوگوں پر کفر و الحاد کے فتوے چسپاں کرنا بالآخر خود دین و مذہب کے لیے مضر ثابت ہوگا۔

سوچنا چاہیے کہ اس وقت جو مسائل بالعموم ملک اور قوم کے سامنے ہیں' ان میں سے آخر کون سے مسئلے کا کوئی خاص تعلق دین و مذہب سے ہے؟ طرز حکومت وحدانی ہو یا وفاقی'جمہوریت صدارتی ہو یا پارلیمانی'انتخابات بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ 'مغربی پاکستان ایک صوبہ رہے یا دوبارہ متعدد صوبوں میں منقسم ہوجائے۔ جس طرح ان تمام مسائل میں اسلام کا کوئی ایک منصوص حکم نہیں ہے بلکہ حالات و ضروریات کے اعتبا رسے مناسب تر کوئی صورت بھی اختیار کی جا سکتی ہے اسی طرح ان مسائل میں بھی اسلام میں حالات و ضروریات کے مطابق مناسب صورتیں اختیار کرنے کی بڑی گنجائش ہے کہ زمین کا بندوبست کن بنیادوں پر ہو اور بڑی بڑی صنعتوں اور ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت برقرار رکھی جائے یا انہیں اجتماعی ملکیت قرار دے کر حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ مزارعت کا مسئلہ ہمارے یہاں سلف سے متنازعہ فیہ چلا آ رہا ہے اور حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کو مجاہدین کے مابین تقسیم کرنے کی بجائے پوری ملّت اسلامی کی اجتماعی ملکیت قرار دے کر ایک اہم اجتہاد فرمایا تھا جس پر پوری امت کا اجماع بھی ہوگیا تھا۔ لہٰذا ان مسائل میں دلیل کی بنیاد پر کوئی ایک یا دوسرا موقف تو اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن اپنی کسی رائے کو اسلام کا حتمی فیصلہ قرار دے کر بقیہ آراء کو کفر و الحاد قرار دے دینا یقیناً زیادتی اور حدود سے تجاوز ہے۔ ہماری رائے میں بالکل صحیح کہا ہے مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہ اصل

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام مسائل و معاملات اور ان کی پیچیدگیوں اور مشکلات کا صحیح فہم حاصل کیا جائے اور ان کے حل کی مخلصانہ کوشش کی جائے' نہ یہ کہ جو بھی ذرا عام روش سے ہٹ کر بات کرے اس کے خلاف کفر

و الحاد کے فتووں کی توپیں داغنی شروع کردی جائیں۔

پاکستان میں بحالی جمہوریت کے علمبردار اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اب پھر بس قبل از مارشل لاء کی سی جمہوریت ملک میں دوبارہ قائم ہو سکتی ہے اور بالکل اسی طرح کے سے حالات لوٹ کر آسکتے ہیں تو وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اس ملک میں اب حقیقی عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہورہا ہے اور جمہور اب صرف اس بات پر کبھی قانع نہ ہوں گے کہ ان کو ''ووٹ'' کی صورت میں سرمایہ داروں سے کچھ ''نوٹ'' حاصل کرنے کا ایک کاغذی سا حق مل جائے بلکہ وہ اپنے تمام سیاسی و معاشی حقوق کے حصول کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے سے گریز نہیں کریں گے۔ اس صورت حال میں اگر کسی نے مذہب کو ان کے خلاف دلیل کی حیثیت سے استعمال کیا تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلے گا اور وہ یہ کہ مذہب کے ساتھ عوام کا رہا سہا تعلق بھی ختم ہوجائے گا اور مذہب سے بیزاری کی عام رو چل نکلے گی۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ہوش مند لوگوں کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی پہلی نشست اگرچہ کل نصف گھنٹے کی تھی اور اس کی نوعیت خالص رسمی ملاقات کی تھی تاہم اس سے آئندہ صورت حال کا پورا نقشہ سامنے آگیا ہے اور اگرچہ فی الحال شرکائے کانفرنس بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں...چنانچہ کسی جانب سے ''عبوری قومی حکومت'' کا نام لیا جا رہا ہے اور کوئی صرف نئے انتخابات تک کے لیے ''عارضی نگران ادارے'' کا نام لے رہا ہے' کوئی ۱۹۵۶ء کے دستور کی کامل بحالی کا مطالبہ کر رہا ہے تو کوئی بالکل نئے سرے سے دستور سازی کا تقاضا کر رہا ہے۔ ون یونٹ توڑنے کا مطالبہ تو پرانا ہی تھا' اب شیخ مجیب الرحمن صاحب مشرقی و مغربی خطوں کے مابین مساوات (parity) کے اصول کو بھی ختم کرنے پر تل گئے ہیں۔ غرضیکہ وہ تمام مسائل از سر نو اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن کی بنا پر پاکستان میں دستور سازی کے کام میں ابتداءً تاخیر و تعویق ہوئی تھی اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ پاکستان کی ان تمام دستوری پیچیدگیوں کے حل کی عملی صورت کیا ہوگی... تاہم یہ بات واضح ہے کہ کنونشن' کونسل اور عوامی تینوں لیگوں ہی کے مابین کچھ لے اور دے کر اور کسر و انکسار کے اصول کے تحت کوئی معاہدہ ہوجائے

گا اور ان ہی کے اتحاد و اتفاق سے کوئی مضبوط حکومت مرکز میں بن سکے گی۔ یہ بھی بالکل واضح ہے کہ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو کے اتحاد سے اصل اپوزیشن وجود میں آئے گی اور مقابل کے اصل دھڑے یہی دو ہوں گے۔ باقی رہے ڈی اے سی کے دوسرے شرکاء تو ان میں سے بعض ادھر اور بعض اُدھر ہوجائیں گے۔ مغربی پاکستان کا ولی و

قصوری گروپ اور مشرقی پاکستان کے شش نکاتی عوامی لیگ کے انتہا پسند طبقات اپوزیشن کے جانب آئیں گے اور مذہبی جماعتوں میں سے جمعیت علمائے اسلام بلاواسطہ یا بالواسطہ ان ہی کے پلڑے میں وزن ڈالے گی۔ دوسری طرف نظام اسلام اور جماعت اسلامی چاہے فوراً حکومت میں شرکت کو ترجیح دیں یا فی الحال باہر رہنے کو پسند کریں' بہرحال متذکرہ بالا اتحادِ ثلاثہ کو سہارا دیں گی !

آئندہ کی سیاست کا عملی نقشہ یہ بنے یا کوئی اور' ہماری دلی خواہش جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا' صرف یہ ہے کہ سارے معاملات سیاست کے کھلے میدان میں معروف طریقے پر طے ہوں اور نہ تشدد' انارکی اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو نہ انقلابی طور طریقے اختیار کیے جائیں۔

خدا کرے کہ اب ملک کے دونوں خطوں میں حالات معمول پر آجائیں۔ تعلیمی ادارے کھل جائیں اور زندگی کا عام کاروبار معمول کے مطابق جاری رہے اور طوفانی سیاست کی کوئی نئی لہر ملک کو اپنی گرفت میں نہ لے لے۔ اس لیے کہ اب اگر کوئی نئی لہر اٹھی تو اس کا رنگ بالکل مختلف ہوگا۔ صدر ایوب اور ان کی حکومت تو اب میدان سے عملاً ہٹ ہی گئے ہیں۔ اب اگر تصادم ہوا تو عوام کا عوام سے ہوگا اور اس کے نتائج نہایت سنگین ہوں گے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو دونوں اپنی موجودہ شکست کو کھلے دل سے قبول کرکے معروف طریقے پر اپوزیشن کا کردار اختیار کرلیں اور اپنی قوت کے مظاہرے اور کسی انقلابی اقدام کا خیال دل میں نہ آنے دیں...بصورتِ دیگر پاکستان کے مشرقی و مغربی دونوں خطوں میں عوامی تصادم شدید ترین صورت میں ظاہر ہوگا۔ مشرق میں اصل مقابلہ مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمن کے مابین ہوگا جبکہ مغرب میں مسٹر بھٹو اور جماعت اسلامی کے حامی طلبہ میں۔ مغرب میں تو دھمکیوں اور جوابی دھمکیوں کا آغاز بھی ہوچکا ہے،

مشرق میں فی الحال خاموشی ہے لیکن یہ خاموشی کسی بہت بڑے ٹکراؤ کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے ۔اللہ تعالیٰ ہی اس نازک موقع پر پاکستان کی حفاظت فرمانے والا ہے !

--------(۲)--------

آزادیٔ ہند کے بعد ابتداءً عام خیال یہ تھا کہ بھارت میں کمیونسٹ انقلاب کے امکانات بہت روشن ہیں جبکہ پاکستان میں اس کا دور دور تک کوئی امکان نہیں لیکن گزشتہ چھ ماہ کے دوران رفتہ رفتہ یہ بات واضح ہوتی چلی گئی ہے کہ در اصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اور آج کا پاکستان بھارت کے مقابلے میں کمیونزم اور سوشلزم سے زیادہ قریب ہے۔ سوچنا چاہیے کہ اس انقلاب کے اسباب کیا ہیں۔

متذکرہ بالا عام خیال کی بنیاد اس مغالطے پر تھی کہ پاکستان میں مذہب ایک موثر قوت ہے اور وہ کمیونزم کے سیلاب کی راہ میں ایک مضبوط بند ثابت ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ تھا اور حقیقت اس

کے بالکل برعکس یہ ہے کہ قومی حیثیت سے ہمارے اوپر بھی مذہب کا رنگ ایک ملمع سے زیادہ نہیں۔ اس لیے کہ جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا 'مذہب نہ ہمارے فکر پر حاوی ہے اور نہ ہی اسے ہمارے اصل موثر طبقات کے جذبات میں کوئی حقیقی نفوذ حاصل ہے۔ خالص عوامی سطح پر جو جذباتی لگاؤ مذہب کے ساتھ ہے اس کی اجتماعیات میں کوئی فیصلہ کن اہمیت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا کمیونزم کی متوقع روک تھام کرنے والا یہ دفاعی بند محض ہوائی و خیالی تھا اور اس کا بے حقیقت ہونا اب ثابت ہو چکا۔

اس اعتبار سے تو پاکستان اور بھارت ایک ہی جیسے تھے لیکن دو باتوں میں ان کے مابین بہت فرق و تفاوت تھا۔

ایک یہ کہ یہاں فکر اور نظریے کے میدان میں ایک گھپلا اور الجھاؤ مسلسل جاری رہا اور قوم کے اصل مؤثر طبقات کی لادینیت کے ساتھ ایک سطحی اور عوامی مذہبیت مسلسل الجھتی رہی جبکہ بھارت خالص لا دینیت کی راہ پر گامزن رہا اور اس میدان میں کوئی منافقت کی راہ اس نے اختیار نہ کی۔

اور دوسرے یہ کہ ہمارے یہاں ایک مہیب سیاسی خلا تھا۔ چنانچہ نہ کوئی مضبوط سیاسی

جماعت موجود تھی نہ قابلِ اعتماد قومی قیادت جبکہ بھارت میں ایک عظیم اور محکم سیاسی جماعت بھی موجود تھی اور ایک مضبوط اور معتمد علیہ قومی قیادت بھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہماری یہ ''عریاں حقیقت نگاری'' بہت سے لوگوں پر بڑی گراں گزرے گی' لیکن ہم مجبور ہیں کہ صورتِ واقعہ جیسی کچھ ہمیں نظر آتی ہے ویسی ہی بیان کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے نظریاتی گھپلے اور سیاسی خلا ہی نے موجودہ صورتحال کو جنم دیا ہے اور حالات کے رخ میں کوئی تبدیلی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ایک طرف نظریے اور فکر کے میدان میں دوغلے پن کو ختم کر کے یک سوئی و یک رنگی اختیار کی جائے اور دوسری طرف سیاسی میدان کے خلا کو مضبوط اور محکم سیاسی جماعتوں اور کھلی اور بے روک ٹوک سیاسی سرگرمی کے ذریعے پر کیا جائے۔

دوسری بات کے ضمن میں تو ہم تفصیل کے ساتھ اوپر لکھ چکے ہیں' اب چند گزارشات پہلی بات کے ذیل میں عرض کرنی ہیں۔ خصوصاً اس امر کے پیش نظر کہ بعض حضرات نے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ ''ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد'' کو ختم کر دیا جائے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ پاکستان میں نظریے اور فکر کے میدان میں جو الجھاؤ موجود ہے اس کو جانب لادینیت نہیں بلکہ جانب دین و مذہب ہی سلجھانا ممکن ہے۔ اگر یہ بات مسلم ہے کہ کسی ملک اور قوم کی اصل قوت اس کے عوام ہی ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ پاکستان کے عوام کا جذباتی تعلق بہرحال دین و مذہب ہی کے ساتھ ہے 'لادینیت و لا مذہبیت کے ساتھ نہیں۔ نتیجتاً قوم میں فکر و نظر کی یکسانی و یک رنگی پیدا کرنے کی صرف ایک صورت

ممکن ہے اور وہ یہ کہ قوم کے طبقہ خواص کے اذہان بھی دین و مذہب کے رخ پر ڈھلیں اور ان کے قلوب بھی اسلام و ایمان کے نور سے منور ہوں۔ لیکن یہ کام جس قدر اہم اور ضروری ہے اسی قدر مشکل اور کٹھن بھی ہے' اور محض سیاسی میدان میں عوام کی مذہبیت کے سہارے دین و مذہب کے نعرے لگانے سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضرورت ہے ایک عظیم علمی و تعلیمی تحریک کی جس کے ذریعے ایک طرف علم کو مومن بنایا جائے اور دوسری جانب آئندہ نسلوں کو مسلمان بنا کر اٹھایا جائے۔ چونکہ یہی وہ چیز ہے جس پر ہمارے نزدیک اسلام کے مستقبل اور احیائے اسلام اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا دارومدار بھی ہے اور پاکستان کے بقا و تحفظ کا انحصار بھی' لہٰذا ہم ان صفحات میں بھی اسی کی اہمیت بار بار اجاگر کرتے رہے ہیں۔ اپنی حقیر قوتوں اور صلاحیتوں اور محدود فرصت و مہلت عمر کا مصرف بھی ہم

نے یہی قرار دیا ہے کہ خالص قرآن حکیم کی بنیاد پر ایک علمی و فکری تحریک کا اجراء ہو اور اس کے لیے ابتدائی اقدام کے طور پر ایک قرآن اکیڈمی قائم کی جائے۔ (الحمد للہ کہ قرآن اکیڈمی کا سنگ بنیاد ۱۹۷۶ء میں رکھ دیا گیا تھا اور اب تو اس کے کوکھ سے قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم بھی برآمد ہو چکے ہیں!)

علم و فکر کے میدان میں انقلابی کام کی توقع حکومتوں سے بالعموم نہیں ہوتی' اس لیے کہ حکومتیں عموماً موجود الوقت فکری و نظریاتی ماحول کی عکاسی ہی کر سکتی ہیں۔ رائج الوقت فکری دھاروں کو بدلنا عام طور پر افراد اور پرائیویٹ اداروں ہی کے کرنے کا کام ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے گزشتہ اکیس سالوں کے دوران جدید و قدیم کے امتزاج کی ضرورت کے احساس کے تحت جتنے ادارے حکومت کی زیر سرپرستی قائم ہوئے وہ دین سے زیادہ بے دینی کے رخ پر بہہ نکلے اور ان سے اکثر و بیشتر فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا جس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال ادارہ تحقیقات اسلامی کراچوی ثم اسلام آبادی ہے۔

اس ادارے کی داستان بہت طویل ہے۔ یہ اولاً کراچی میں مرحوم لیاقت علی خان کے دورِ حکومت میں مرحوم ظہیر الدین لال میاں کے پرزور اصرار پر قائم ہوا تھا۔ یکے بعد دیگرے متعدد حضرات اس کی سربراہی کے منصب پر فائز ہوئے لیکن اس کے کام کا کوئی واضح نقشہ متعین نہ ہو سکا۔ ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کے بعد اس کی سربراہی ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کے ہاتھ آئی اور ۱۹۶۲ء کے دستور میں اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل الفاظ میں متعین ہوئے:

THE FUNCTION OF THE INSTITUTE SHALL BE TO UNDERTAKE ISLAMIC RESEARCH AND INSTRUCTION IN ISLAM FOR THE PURPOSE OF ASSISTING IN THE RECONSTRUCTION OF MUSLIM SOCIETY ON A TRULY ISLAMIC BASIS.

لیکن افسوس کہ اس ادارے نے بجائے اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے بالکل دُور از کار اور لایعنی بحثوں کے دروازے کھول دیے جن سے الجھنوں ہی میں اضافہ ہوا اور فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ نتیجتاً عوام میں اس ادارے کے خلاف غم اور غصہ کے

جذبات پیدا ہوئے جس کی انتہائی صورت پچھلے دنوں اس مطالبے کی شکل میں سامنے آئی کہ اس ادارے ہی کو بند کر دیا جائے۔

ہمارے نزدیک یہ مطالبہ محض غصے اور جھنجھلاہٹ کا مظہر ہے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ یہ مطالبہ کیا جائے کہ چونکہ پاکستان اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے حاصل کیا گیا تھا لیکن گزشتہ اکیس سال کے عرصے میں یہاں نہ صرف یہ کہ اسلام کی جانب کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی بلکہ اُلٹی لادینیت اور اباحت پسندی ہی کو ترقی ہوئی لہٰذا پاکستان کا وجود عبث ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیے۔

ہمارے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ مطالبہ کیا جائے کہ اس ادارے کو جس پر پاکستان کے غریب عوام کا کروڑوں روپیہ خرچ ہو چکا ہے اور لاکھوں روپیہ ہر سال خرچ ہو رہا ہے ' صحیح اور اہل لوگوں کے سپرد کیا جائے اور اس سے بالفعل وہی مقصد حاصل کیا جائے جس کے لیے اسے قائم کیا گیا تھا۔

پاکستان میں آئندہ جو حکومت بھی بنے' اور جو لوگ بھی برسر اقتدار آئیں' ان سے ہماری مخلصانہ گزارش یہی ہے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ پاکستان کی ترقی و استحکام ہی نہیں اس کا عین وجود بھی اسی ایک امر پر منحصر ہے کہ آیا اسلام یہاں خواص و عوام دونوں کے اذہان و قلوب میں رچ بس کر پوری قوم میں فکر و نظر کی ہم آہنگی و یک رنگی پیدا کرتا ہے یا نہیں۔ اگر ہم نے جلد اس سوال کا مثبت جواب عملاً پیش نہ کیا تو جو صورت حال سامنے ہے اس کے پیش نظر دنیا کی اس عظیم ترین مسلمان مملکت کا چھوٹی چھوٹی علاقائی و لسانی قومیتوں میں بٹ کر منتشر ہونا اور پھر انہی بنیادوں پر آس پاس کی بڑی قومیتوں میں ضم ہو جانا یقینی ہے ... اور یہ کام محض تقریروں اور بیانوں میں اسلام کی تعریف و توصیف سے نہیں ہوگا بلکہ صرف اس طرح ہوگا کہ ایک طرف علوم کو مسلمان بنایا جائے اور ایمان باللہ ہی کی بنیاد پر تمام طبعی 'عمرانی اور نفسیاتی علوم کی تدوین جدید ہو اور دوسری طرف نظامِ تعلیم کے پورے ڈھانچے کو ازسرِ نو اسلامی خطوط پر استوار کیا جائے۔ ان دونوں کاموں میں بھی مقدم چونکہ بہرحال علوم کی تدوین جدید ہی ہے اور اس ضمن میں اسلامی ریسرچ کے سرکاری و نیم سرکاری ادارے نہایت وقیع خدمت سر انجام دے سکتے ہیں' لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ یہ ادارے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیے جائیں جو جدید و قدیم دونوں علوم پر حاوی بھی ہوں اور ذہناً مسلم اور قلباً مومن بھی ہوں اور اسلامی ریسرچ کے کام کو صحیح خطوط

پر آگے بڑھا سکیں۔ خدا کرے کہ یہ اہم ترین کام جو ہمارے یہاں اب تک نظر انداز ہوتا آیا ہے' اب مزید مؤخر نہ ہو!

اس سلسلے میں اپنی جانب سے ایک حقیر سی کوشش کے طور پر ہم ہی نے ''تحقیق اسلامی: اس کے معنی و مدعاو دائرہ کار'' کے موضوع پر محترم ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا مقالہ بالاقساط ''میثاق'' میں شائع کیا اور ان شاء اللہ بہت جلد اسے ایک پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کردیں گے (یہ کتاب شائع ہوچکی ہے اور مکتبہ انجمن سے حاصل کی جا سکتی ہے)۔ ہمارے نزدیک یہ مقالہ اپنے موضوع پر قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ قوم کا ہر صاحبِ بصیرت شخص جو ذہناً و قلباً مومن و مسلم ہو' اس کے مندرجات کو اپنے دل کی آواز محسوس کرے گا۔

* * *

باب دوم

جنرل محمد یحییٰ خان کا مارشل لاء

مئی ۱۹۶۹ء

ملک میں مارشل لاء کو نافذ ہوئے سوا مہینہ ہوگیا ہے اور اس عرصے میں وہ گومگو کی سی کیفیت اور غیر یقینی سی صورتحال ختم ہوچکی ہے جو کسی اچانک تبدیلی کے بعد کچھ عرصہ تک فطری طور پر طاری رہتی ہے۔ اس دوران میں نہ صرف یہ کہ حالیہ فوجی حکومت کے ذمہ دار حضرات نے قوم کو بار بار یہ اطمینان دلایا ہے بلکہ اب تو ان کے طرزِ عمل سے بھی بہت حد تک ثابت ہوگیا ہے کہ نہ وہ کوئی سیاسی عزائم رکھتے ہیں اور نہ ہی اپنے دور اقتدار کو غیر ضروری طول دینے کے خواہش مند ہیں بلکہ ان کا مقصد محض ایک ایسی صورتحال کو جو بالکل بے قابو ہوئی جا رہی تھی 'قابو میں لانا اور ملک کی سیاسی زندگی کی گاڑی کو ازسرِنو صحیح پٹڑی پر ڈالنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ امر انتہائی اطمینان بخش ہے اور موجودہ فوجی قیادت اس پر پوری قوم کے تشکر و امتنان کی مستحق ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حالیہ مارشل لاء گزشتہ مارشل لاء سے بہت مختلف ہے جو بڑی آن بان کے ساتھ ملک وملت کے جملہ عوارض و امراض کی مسیحائی کے دعوے کے ساتھ آیا تھا اور جس نے صرف ایک نیا تنظیمی ڈھانچہ ہی نہیں بلکہ ایک مکمل جدید سیاسی فلسفہ اور مختلف عمرانی معاملات حتیٰ کہ دینی و مذہبی مسائل میں بھی ایک نیا انداز فکر قوم پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے معاملات مارشل لاء کے فطری دائرہ کار سے باہر ہیں۔ مارشل لاء کبھی کسی قوم یا ملک کے امراض و عوارض کا مستقل اور پائیدار علاج نہیں بن سکتا۔ اس کی مثال زیادہ سے زیادہ ان فوری اور سریع الاثر مگر خالص وقتی اور عارضی افاقہ بخش ادویہ کی سی ہے جو کسی مرض کی بحرانی کیفیت میں فوری خطرے کو ٹالنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

ہم ان صفحات میں اس سے قبل بھی عرض کر چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ دیانت دار اور باضمیر سیاسی کارکنوں، منظم و محکم سیاسی جماعتوں اور مسلسل اور پیہم سیاسی سرگرمی کا فقدان ہماری قومی و ملی زندگی کا ایک مہیب اور خطرناک خلا ہے جسے لازماً پر کیا جانا چاہیے۔ اب

ظاہر ہے کہ یہ خلا اگر پر ہو سکتا ہے تو سیاسی سرگرمی ہی سے ہو سکتا ہے، کوئی دوسری چیز اس کا بدل نہیں بن سکتی اور مارشل لاء ہرگز اس خلاء کو پر نہیں کر سکتا۔ مارشل لاء زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ ملک کی انتظامی مشینری کو پوری رفتار سے حرکت میں لے آئے، سستی اور کاہلی کا قلع قمع کر دے، سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں جمع شدہ کام تیزی سے پورا کرادے، دھاندلی اور غنڈہ گری کا سدباب کر دے، شہری زندگی کی بد عنوانیوں کا خاتمہ کرا دے اور سرکاری واجبات کی وصولی کا فوری بندوبست کر دے۔ اور الحمد للہ کہ یہ سارے کام پورے زور شور کے ساتھ اس وقت جاری ہیں۔ رہا ملک اور قوم میں فکری و نظریاتی ہم آہنگی پیدا کرنا اور ملک و ملت کو ایک جذبہ تازہ دے کر سرگرمِ عمل کرنا تو ظاہر ہے کہ نہ کسی فوجی حکومت سے اس کی توقع کی جاتی ہے اور نہ ہی خدا کا شکر ہے کہ ان معاملات میں موجودہ فوجی قیادت نے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ کسی لمبی چوڑی مہم کا آغاز ہی کیا ہے۔ خدا کرے کہ یہ صورتحال برقرار رہے اور صدر مملکت آغا محمد یحییٰ خان اپنی ذمہ داریوں میں اضافہ کرنے کی بجائے جلد از جلد ان سے سبکدوش ہونے کی کوشش کریں۔

بد قسمتی سے ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ایک طرف تو ہر چڑھتے سورج کی پرستش کو اپنا فرض عین سمجھتے ہیں اور دوسری طرف ہر اس شخص کو جو کسی وقت کسی طرح برسر اقتدار آجائے، قوت و اقتدار کے نشے میں مست کر کے اس کے ذریعے اپنا اُلو سیدھا کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ سروسز میں بھی کثرت سے ہیں اور پرانے زمینداروں اور نئے صنعت کاروں میں بھی۔ حال ہی میں ان کی صفوں میں کچھ سرگرمی کے آثار بھی نظر آئے ہیں۔ خدا کرے کہ موجودہ فوجی قیادت ایسے لوگوں کے منحوس اثرات سے محفوظ رہے اور کم سے

کم مدت میں ان نازک ذمہ داریوں سے عہد برآ ہو کر جو اس وقت اس کے کاندھوں پر آ گئی ہیں ‘اپنی تمام تر توجہات اور مساعی کو اپنی اصل اور مستقل ذمہ داری یعنی دفاعِ وطن عزیز پر مرکوز کر دے۔

مارشل لاء کے نفاذ سے قبل مسلسل پانچ چھ ماہ سے جو ہنگامی صورتحال پورے ملک پر طاری چلی آ رہی تھی اس کے یک لخت خاتمے سے جو پرسکون کیفیت پیدا ہوئی اس میں ملک و ملت کے بہی

خواہوں میں سے بہت سے اصحاب فکر و نظر نے ان عوامل کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے جن کے نتیجے میں ہمارے یہاں سیاسی عدم استحکام اور فکری و نظریاتی انتشار پیدا ہوا ہے اور یومًا فیومًا بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ اخبارات و رسائل میں بہت سے عمدہ مضامین اس موضوع پر شائع ہوئے ہیں جن سے یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے اصحابِ فکر و نظر اس امر کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ قوم میں فکر و نظر کی وہی یک جہتی اور جذبہ و عمل کی وہی ہم آہنگی دوبارہ پیدا کی جائے جو آج سے تقریباً ربع صدی قبل کچھ عرصے کے لیے ملت اسلامیہ پاک و ہند میں پیدا ہوئی تھی اور جس کے نتیجے کے طور پر پاکستان وجود میں آیا تھا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ اُس وقت وہ کیفیت کیوں اور کن اسباب و عوامل سے پیدا ہوئی تھی اور آج اسے کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے ! مبہم طور پر یہ کہہ دینا کہ اُس وقت بھی وہ جذبہ اسلام کی بنیاد پر پیدا ہوا تھا اور آج بھی اسے اسلام ہی کی بنیاد پر دوبارہ پیدا کیا جا سکتا ہے‘ شاعری میں تو شاید روا ہو لیکن ملک و ملت کے ٹھوس مسائل سے بحث کرنے والی سنجیدہ علمی تحریروں کے شایانِ شان نہیں ...اس لیے کہ اس کے معاً بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ سب کچھ اسلام ہی کی بنیاد پر تھا تو بعد میں وہ ختم کیوں ہو گیا جبکہ اسلام سے نہ اس قوم کے عوام منحرف ہوئے نہ خواص بلکہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا جو یہاں کبھی کسی حیثیت سے برسرِ اقتدار رہا ہو اور اٹھتے بیٹھتے اسلام کا کلمہ نہ پڑھتا رہا ہو اور اپنے جملہ مسائل و مشکلات کا حل اسلام ہی میں نہ بتاتا رہا ہو۔

ہمارے یہاں ’’اسلام !‘‘... ’’اسلام !‘‘اور ’’پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ ‘‘کے نعرے اِس وقت جس زور شور کے ساتھ لگ رہے ہیں‘ ویسے تو ہمارے لیے وہ ہر حال میں خوش آئند ہیں اور ہم بہر صورت انہیں خوش آمدید کہتے ہیں‘ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج سے ربع صدی قبل کسی محکم اور پائیدار اساس کے بغیر محض ہوا میں ان نعروں کی گونج پیدا کر کے مسلسل بائیس سال تک ہم جس طرح ان کی مٹی پلید کرتے آئے ہیں‘ ہمیں خدشہ ہے کہ آج جس انداز سے یہ نعرے لگ رہے ہیں اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ مستقبل میں ان کی حرمت کو کچھ اور بھی زیادہ ہی بٹا لگایا جائے گا اور ان مقدس الفاظ کی رسوائی پہلے سے بھی کچھ زائد ہی ہوگی۔ اس کا تھوڑا سا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس وقت جو جلوس یہ نعرے لگاتے تھے ان میں شامل

خواتین کی اکثریت باپردہ اور برقع پوش ہوتی تھی جبکہ آج وہ نوجوان لڑکیاں ان کی علمبردار ہیں جو پردے اور برقعے کی قید سے بالکل آزاد ہوچکی ہیں اور نیم عریاں ٹیڈی لباس میں ملبوس ہیں۔ ع

''قیاس کن زگلستان من بہار مرا!''

ہمارے یہاں اس وقت جن اصحابِ قلم و قرطاس نے اسلام کی دہائی دی ہے ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو سوشلزم کے ہوے سے خوف زدہ ہوکر اسلام کی پناہ گاہ کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور جن کے دین و مذہب سے تازہ شغف کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ع

''جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا!''

ان کو ایک طرف رکھتے ہوئے بعض ایسے حضرات کا حال بھی 'جن کے خلوص اور اخلاص کے ہم بھی معترف ہیں اور جن کے بارے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ اسلام کے قدیم شیدائی و فدائی ہیں' یہ ہے کہ خود ان کا مسجد سے کوئی رشتہ و تعلق نہیں اور ان کی جوان لڑکیاں بے پردہ گھومتی اور ''قتالہ عالم'' کا لقب پاتی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

خدا کے لیے حقائق کا مواجہہ کرنا سیکھئے! حقائق سے گریز محض خود فریبی ہے' اس سے نہ یہ ارض و سماء دھوکا کھاتے ہیں نہ خالق ارض و سماوات اور {وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَہُمْ} کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے تو پوری امت مسلمہ بحیثیت مجموعی کب کی دستبردار ہوچکی۔ دین و مذہب کے ساتھ اس کا مخلصانہ رشتہ استوار ہوتا تو یہ عالمگیر ذلت و رسوائی سے دوچار ہی کیوں ہوتی۔ غلطی {اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳۹﴾} میں نہیں' امت کے دعویٰ ایمان میں ہے۔ ؎

میرؔ کے دین و مذہب کی کیا پوچھو ہو جی' ان نے تو
قشقہ کھینچا' دیر میں بیٹھا' کب کا ترک اسلام کیا

مدت مدید گزری کہ اسلام کا شجرہ طیبہ بیخ و بن سے اکھڑ چکا اور اب از سر نو تخم ریزی و آبیاری کا محتاج ہے۔ دین و مذہب کی عمارت محض شکستہ ہی نہیں ہوئی کہ ادھر اُدھر کی مرمت سے کام چل جائے' یہ عظیم تعمیر کبھی کی زمین بوس ہوچکی ۔ اگرچہ اس کے کھنڈر اب بھی اس کی عظمت رفتہ کے شاہد ہیں' تاہم اب ضرورت بالکل بنیاد سے

از سر نو تعمیر کی ہے اور افسوس کہ اُمت مسلمہ تا حال اس حقیقت کے اعتراف تک پر آمادہ نہیں‘ بلکہ مسلسل مغالطے ہی میں مبتلا رہنے پر مصر ہے۔ تو

پھر کون سے تعجب کی بات ہے اگر ہر تدبیر الٹی پڑتی نظر آئے اور کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ آج سے ربع صدی قبل ملت اسلامیہ پاک و ہند کی باسی کڑھی میں جو اُبال آیا تھا اس کا اصل محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا‘ نہ آج اس کی ملی و اجتماعی زندگی میں دین و مذہب کو کسی مؤثر عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ اُس وقت کا سارا جوش و خروش ایک ایسی قوم کے جذبہ تحفظ و خود اختیاری کا رہین منت تھا جس کی بنیاد تو صدیوں پہلے مذہب ہی کی اساس پر قائم ہوئی تھی لیکن جس کا دین و مذہب سے تعلق اب محض برائے نام رہ گیا تھا اور جسے کچھ مخصوص حالات میں یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا قومی تشخص ختم ہو جائے گا اور وہ ایک بڑی قومیت میں جذب ہو کر رہ جائے گی۔ اس خالص قومی تحریک کے آخری ایام میں خالص وقتی اور عارضی طور پر کچھ رنگ آمیزی دینی و مذہبی جذبے کی بھی کی گئی تھی‘ لیکن یہ سب کچھ ایک فوری ضرورت (expediency) کے تحت تھا نہ کہ کسی مستقل اور محکم اساس پر۔ چنانچہ جب تحریک ایک حد تک کامیاب ہو گئی اور اس قوم کو اپنے معاشی و سیاسی تحفظ کی ضمانت کے طور پر ایک علیحدہ خطہ مل گیا تو وہ جوش و خروش بھی فوراً ختم ہو گیا ... اور دوبارہ اس کا سراغ کبھی ملا تو صرف اس وقت جب ایک بار پھر ۱۹۶۵ء میں خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں قوم کا یہ دفاعی حصار ٹوٹ نہ جائے اور ہندو امپریلزم کا سیلاب اس قوم کو بہا کر نہ لے جائے۔ پھر جونہی یہ خطرہ دوبارہ ٹلا‘ وہ جذبہ بھی سرد پڑ گیا اور پھر وہی صورتحال طاری ہو گئی ؎

’’اب اسے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر!‘‘

یہ ہیں وہ حقائق جن کا ادراک اس لیے ضروری ہے کہ ملک و ملت کا ہر بہی خواہ اچھی طرح سمجھ سکے کہ مسئلے کی حقیقی نوعیت کیا ہے اور اصلاحِ احوال کے لیے کس جگہ سے کام کی ابتدا لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ علاج کی کامیابی کا سارا دارومدار تشخیص کی صحت و درستی پر ہے۔ ہمارا مرض سطحی نہیں بلکہ بہت گہرا اور نہایت مزمن ہے۔ چنانچہ اس کا علاج بھی سطحی تجاویز سے نہیں‘ بڑی گہری حکیمانہ تدبیر ہی سے ممکن ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کی جرات شاید ہی کوئی کر سکے کہ پاکستان کا استحکام ہی نہیں محض وجود و بقا بھی اسلام ہی سے وابستہ ہے... لیکن خوب

اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اسلام اس وقت ہمارے عقیدہ و عمل دونوں سے خارج ہوچکا ہے اور اب اس کی بازیافت محض نعروں‘ تقریروں‘ مقالوں اور بیانوں سے ممکن نہیں۔

اس کے لیے مسلسل اور پتہ مار کر کام کرنے اور پیہم جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس جدوجہد کا اصل اور اولین میدان علم و فکر کا میدان ہے۔ علم و فکر کا رشتہ ایمان و یقین کے ساتھ از سرِ نو استوار کرنا وقت کی اہم ترین اور مقدم ترین ضرورت ہے۔ پھر اخلاق و اعمال کی دنیا میں انقلاب لانا لازمی ہے۔ اس لیے کہ تطہیر فکر اور تزکیۂ اخلاق کی کٹھن مہموں کے سر ہونے کے بعد ہی اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ قوم کے رگ و پے میں دینی و اسلامی جذبہ سرایت کرجائے اور {اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۪ۙ﴿۱۶۲﴾} کی صورت عملاً پیدا ہو۔

ہماری ان گزارشات سے ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو یہ بدگمانی پیدا ہو کہ شاید ہم فوری طور پر اسلامی نظام کے قیام کی کوششوں کے حامی نہیں‘ یا یہ کہ ہم پر مایوسی کا غلبہ ہے۔ در حقیقت صورتِ واقعہ نہ تو یہ ہے نہ وہ۔ ہم تجدید دین اور احیائے اسلام کی ہر کوشش کی دل سے قدر کرتے ہیں اور خود بھی بحمد اللہ اپنی صلاحیتوں کی حقیر سی پونجی کو اسی مقصد کے لیے کھپا دینے کا عزمِ مصمم رکھتے ہیں۔ پھر ہم یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ بہت جلد انسانیت اپنے مسائل کے حل اور اپنے دکھوں کے مداوا کے لیے اسلام ہی کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہوگی اور وہ دور زیادہ دُور نہیں جب پورے عالم ارضی پر اسلام ہی کا غلبہ ہوگا... لیکن اس کے لیے کیا کام اور کس طرح سے کیا جانا چاہیے‘ اس کے بارے میں ہمارا ایک پختہ نقطۂ نظر ہے اور ہم علیٰ وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ یہ کام کس نہج پر کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں دکھ ہوتا ہے تو اس وقت‘ اور ہمارے لہجے میں تلخی پیدا ہوتی ہے تو تب جب ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے بھلے سمجھ دار لوگ اس معاملے میں غالباً صرف تساہل فکر کی بنا پر محض سطحی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں اور مسئلے کی حقیقی و واقعی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دل میں ایک بے اختیار ہوک اٹھتی ہے اُس وقت جب ہمیں خیال آتا ہے کہ برصغیر کی ایک اچھی بھلی دینی تحریک جو صورتحال کی صحیح تشخیص

کے ساتھ ایک بہت حد تک صحیح طریق کار پر برسر عمل ہوئی تھی‘ وہ بھی قیام پاکستان کے وقت حالات اور مواقع کی ایک وقتی سی ترغیب و تحریص (temptation) کے زیر اثر اپنے موقف سے منحرف اور اپنے نہجِ کار سے دستبردار ہوگئی اور سطحیت فکر و عمل کا شکار ہوکر وہی خالی نعرے لگانے میں مصروف ہوگئی جن کی شدید مذمت ماضی میں وہ خود کرتی رہی تھی ۔ آج بھی جبکہ تقریباً ربع صدی گزر چکی ہے‘ وہ سیاست کے ریگ زار میں حکومت و اقتدار کے سراب کے پیچھے بھٹکتی پھر رہی ہے‘ فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ۔ اس تحریک کا خیال ہمیں بار بار اس لیے آتا ہے کہ خود ہم نے اسی تحریک کی گود میں آنکھ کھولی تھی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تڑپ اسی کے طفیل پائی تھی ؎

گزشتہ منزلیں منزل بہ منزل یاد آتی ہیں
مسافر یہ خلش دل کی بآسانی نہیں جاتی

دین ومذہب سے قطع نظر کہ وہ بے چارے تو ہمارے یہاں اب صرف ''بوقت ضرورت'' استعمال کے لیے رہ گئے ہیں اور اسلام و ایمان کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہ وہ غریب صرف لیڈروں کی تقریروں کا مطلع و مقطع فراہم کرنے کے کام آتے ہیں' خالص قومی سطح پر بھی غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ ہم زندہ قوموں کے لازمی اوصاف سے خطرناک حد تک تہی دست ہیں اور اس میدان میں بھی ہماری تہی دامنی روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ ہماری قومی و ملی زندگی جس طرح پے بہ پے حادثوں سے دوچار ہورہی ہے اور ملکی سیاست کی گاڑی جس طرح بار بار زور دار جھٹکوں کے ساتھ رک جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ آزادی ایسی نعمت عظمیٰ کے حصول سے قبل قومی تعمیر کا کام جس حد تک لازماً ہوجانا چاہیے تھا وہ ہمارے یہاں نہیں ہوا۔ اس عظیم ذمہ داری سے کماحقہ عہدہ برآ ہونے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی وہ ناگزیر حد تک بھی پیدا نہیں ہوئیں۔ گویا آزادی ہمیں ایک ایسے عطیہ کی حیثیت سے ملی جس کے لیے ہم عملاً تیار نہ تھے۔

یہ صورتِ حال بہت مشابہ ہے اس کیفیت سے جس سے بعض وہ طالب علم جو

نچلے درجوں میں رعایتی پاس ہوتے چلے آتے ہیں' کسی بڑے امتحان کے موقع پر دو چار ہوجاتے ہیں... کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی ان کی وہ بنیادی کمی کسی طرح پوری نہیں ہوتی جو بالکل ابتدا میں رہ گئی تھی!

برصغیر کی ہندو قوم میں قومی تعمیر نو کا کام انیسویں صدی کے اواخر ہی سے شروع ہوگیا تھا اور بیسویں صدی کی ابتدا سے تو اس میں بے پناہ جوش و خروش اور جذبۂ عمل پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ ہر جہت اور ہر سمت میں تعمیر و اصلاح کا کام تیزی کے ساتھ شروع ہوا' بے شمار انجمنیں بنیں' لاتعداد ادارے وجود میں آئے' ہزاروں ٹرسٹ قائم ہوئے' چھوٹی بڑی لاکھوں درس گاہیں تعمیر ہوئیں اور لکھوکھا قومی کارکن جذبۂ اخلاص کے مظہر' سادگی و کفایت شعاری کے پیکر اور مجسم قربانی و ایثار بن کر میدانِ عمل میں کود پڑے۔ پھر تعمیر جدید کا یہ کام کسی ایک ہی میدان میں نہیں ہوا بلکہ ایک طرف اگر سیاسی میدان میں ہلچل اور ہماہمی تھی تو دوسری طرف خالص معاشرتی اور سوشل اصلاح اور معاشی فلاح و بہبود کے لیے بھی زور شور سے کام جاری تھا۔ ایک طرف مذہبی اصلاح و تجدید کی کوششیں ہو رہی تھیں اور مذہبی افکار کے تنقیدی جائزے اور ان میں شکست و ریخت اور تالیفِ جدید سے نئے نئے دھرم ایجاد ہورہے تھے تو دوسری طرف صحت و تندرستی کے اصولوں کے پرچار اور ورزش و ریاضت کے عملی پروگراموں سے جسم اور جسمانی قوتوں کے نشوونما کا کام بھی پورے انہماک سے ہورہا تھا۔ غرض ہر شعبۂ زندگی میں

ایک نئی ہلچل اور نئی سرگرمی پیدا ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں پوری ہندو قوم میں بیداری اور حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی اور فی الجملہ آزادی کی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور استعداد اس میں پیدا ہوگئی۔

مسلمان قوم میں صورت اس کے برعکس رہی۔ اس کی اکثریت ''عظمت رفتہ'' کی یاد ہی کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی اور ''پدرم سلطان بود'' کا راگ الاپ کر ہی دل کو تسلی دیتی رہی۔ قومی و ملی تعمیر جدید کا کام تقریباً نہ ہونے کے برابر رہا اور تعطل و جمود کا تسلط اور بد نظمی' انتشار اور طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ ہم اسی حال میں تھے کہ دفعۃً محسوس ہوا کہ غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ ہونے کو ہے اور اس صورت میں ہندوستان کی مسلمان قوم ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر رہ جائے گی۔ چنانچہ فوری طور پر اپنے قومی تشخص کے تحفظ کی ضرورت محسوس ہوئی اور جیسے تیسے ایک قومی تحریک

اٹھی جسے ابتداءً صرف کچھ نوابوں اور جاگیرداروں کی پشت پناہی حاصل تھی اور جس کا دائرہ کار ابتدا میں صرف کچھ آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر قوم کے وہ مذہبی طبقات اس سے بد ظن بھی ہوگئے جو حریت و آزادی کی راہ میں مسلسل قربانیاں دیتے آئے تھے اور جن میں عوامی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی اور اس طرح قوم بے شمار مخلص کارکنوں سے محروم ہوگئی ۔آزادی سے متصلاً قبل ایک دو سال کے لیے اس قومی تحریک میں بھی کچھ عوامی رنگ پیدا ہوا تھا' لیکن ابھی اس کے کارکن بالکل خام حالت ہی میں تھے کہ آزادی کی گھڑی آپہنچی اور اللہ تعالیٰ کے ایک خصوصی عطیہ اور انعام کے طور پر اس قوم کو بھی ایک علیحدہ آزاد مملکت مل گئی ۔

پھر آزادی کیا ملی' گویا دولت و ثروت کا سیلاب آگیا جو قوم کی دیانت و شرافت اور خلوص و اخلاص کی رہی سہی پونجی کو بھی بہا کر لے گیا۔ اولاً متروکہ دولت پر چھینا جھپٹی ہوئی' پھر تجارت و صنعت کے میدانوں میں دولت کے دریا بہنے لگے' دیکھا دیکھی سرکاری ملازموں نے بھی ہاتھ رنگنے شروع کیے اور دشت دولت کے ''ہر آبلہ پا سے زبردستی خراج'' وصول کرنا شروع کیا۔ غرض پوری قوم کے سر پر دولت کا بھوت سوار ہوگیا۔ قومی تعمیر نو کا کام پہلے ہی نہیں ہوا تھا جبکہ اس کے لیے تمام تر اسباب و عوامل بھی موجود تھے تو اب کیا خاک ہوتا! خلوص' دیانت' ایثار اور قربانی نام کی کوئی شے پہلے کہیں کچھ موجود تھی تو اس دور میں بالکل ختم ہوگئی۔ ذمہ داری' احساسِ فرض' تن دہی اور محنت کالعدم ہوگئے۔ سیاست نے ایک کاروبار کی صورت اختیار کرلی اور روپے پیسے یا زیادہ سے زیادہ کنبہ و برادری کے سوا اس میدان میں کوئی سکہ رواں نہ رہا۔ چنانچہ طبقہ متوسط کے وہ لوگ جو قومی تحریک کے آخری ایام میں ملی و قومی جذبات کے تحت سیاست کے میدان میں آگئے تھے' رفتہ رفتہ مایوس اور بددل ہوکر اسے خیرباد کہہ گئے اور سیاست اور حکومت کا پورا معاملہ صرف بڑے زمینداروں' جاگیرداروں اور سرمایہ

داروں کا مشغلہ بن کر رہ گیا۔ ان میں سے جو لبھی کسی وجہ سے مات کھا جاتا تھا ' ایسے خاموش اور بیکار ہو کر بیٹھ رہتا تھا جیسے سیاست بازی کے علاوہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لیے کرنے کا کوئی اور کام ہے ہی نہیں۔ نتیجتاً سیاسی اختلال پیدا ہوا' جوڑ توڑ اور سازش کا بازار گرم ہوا' حکومتیں آئے دن بدلنے لگیں' بین الاقوامی ساکھ اور قومی و ملکی معیشت کا دیوالہ نکل گیا تو پہلا مارشل لاء لگا' جس نے کچھ عرصہ کے لیے ان امراض کی ظاہری علامتوں کو دبا دیا۔ لیکن جونہی خالص فوجی حکومت سے کسی قدر سیاسی و دستوری حکومت کی طرف رجعت

ہوئی' وہی پہلا سماں پھر بندھ گیا اور علامتِ مرض پھر ظاہر ہو گئیں بلکہ حالت پہلے سے بدتر ہو گئی۔

یہ ہیں وہ حالات جن سے ہم بحیثیت قوم دو چار ہیں ... کہ قوم کے سوادِ اعظم کے پیشِ نظر نہ کوئی نظریہ ہے نہ مقصد' نہ قومی و ملی ذمہ داریوں کا احساس ہے نہ شہریت کے فرائض کا ' پھر نہ کوئی مستحکم قومی تنظیم موجود ہے نہ قابل اعتماد قومی قیادت۔ سیاسی شعور کی کمی کا یہ حال ہے کہ جو چاہے وقتی طور پر نعرے لگائے اور عارضی طور پر قوم کو اپنے پیچھے لگا لے۔ قیادت کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ جس شخص کے بارے میں ذرا یہ معلوم ہو کہ دیانت دار اور مخلص آدمی ہے' قوم بالکل یتیموں کی طرح سرپرستی کے لیے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیتی ہے چاہے وہ سیاست کے میدان میں بالکل نووارد ہی ہو اور سیدھا کسی سرکاری محکمے کی ملازمت سے فارغ ہو کر چلا آرہا ہو۔ وَ قِس علی ھذا!

اس میں شک نہیں کہ حال ہی میں بعض گروہ ایسے بھی سامنے آئے ہیں جو کچھ واضح نظریات بھی رکھتے ہیں اور کسی قدر محکم تنظیمی سلسلے بھی' لیکن چونکہ ابھی ان کا حلقہ اثر بہت محدود ہے وہ وسیع تر ملی و قومی تقاضوں کا جواب نہیں بن سکتے۔

یہ حالات متقاضی ہیں کہ ملت اسلامیہ پاکستان کا ہر فرد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے ان کو ادا کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہو جائے اور ان بنیادی کمزوریوں' کمیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کے لیے کوشاں ہو جو عرصۂ دراز سے چلی آ رہی ہیں اور اس طرح دین و مذہب' علم و فکر' تعلیم و تربیت' تطہیر اخلاق و عمل' سماجی و معاشرتی اصلاح' قومی و ملی تنظیم غرض ہر میدان میں اصلاح و تعمیر کا عمل تیزی سے شروع ہو جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم بحیثیت ملک و ملت اس وقت موت و زیست کی کشمکش سے دو چار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قدرت کی جانب سے عطا کردہ مہلت ہماری غفلت میں اضافے کا موجب ہو اور پھر قانونِ خداوندی کا کوئی کوڑا ہم پر اچانک برس پڑے!

باب سوم

''مری تعمیر میں مضمر تھی

کچھ صورت خرابی کی!''

جولائی ۱۹۶۹ء

میڈیکل کالج لاہور میں اپنے پانچ سالہ عرصہ تعلیم کے دوران راقم الحروف نے معمارِ پاکستان محمد علی جناح مرحوم کا حسب ذیل فقرہ جو کالج ہال کی دیوار پر نہایت جلی حروف میں لکھا ہوا تھا' بلا مبالغہ سینکڑوں مرتبہ پڑھا ہوگا:

God has given us a golden opportunity to show our worth as architects of a new nation (or state?) and let it not be said that we did not prove equal to the task (۱)

پھر کچھ تو اس بنا پر کہ فقرہ بجائے خود نہایت جاندار تھا اور اس کے الفاظ کا دروبست نہایت موزوں تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان ابھی نیا نیا بنا تھا اور ہر پاکستانی مسلمان کے دل میں ایک ''ولولہ تازہ'' موجزن تھا اور اس جملے میں گویا ہر شخص کو اپنے ہی دل کی صدا سنائی دیتی تھی' یہ فقرہ کچھ اس طرح ذہن میں ثبت ہوگیا تھا کہ آج تک من و عن یاد ہے۔

لیکن ... افسوس... کہ آج جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے بائیس سال ہونے کو آئے اور خود محمد علی جناح مرحوم کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا' مملکت ِخداداد پاکستان بزبانِ حال نوحہ خواں ہے کہ اس کے بانی و مؤسس کا خدشہ صحیح ثابت ہوا اور اس نئی مملکت کو وہ معمار میسر نہ آسکے جو ایک انگریز شاعر کے قول کے مطابق ''اس کے ستونوں کو نہایت گہری اور پختہ بنیادوں سے اٹھاتے اور پھر تعمیر کرتے ہوئے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتے!''(۲) بائیس سال گزر _____ (۱) یعنی ''(مملکت خداداد پاکستان کی صورت میں) اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک نئی قوم (یا مملکت؟) کے معماروں کی حیثیت سے اپنی اہلیت و صلاحیت کے

اظہار کا ایک سنہری موقع عطا فرمایا ہے اور دیکھنا ! ایسا ہرگز نہ ہو کہ دنیا یہ کہے کہ ہم اس عظیم کام کے اہل ثابت نہیں ہو سکے ! ‘‘ (۲) They build a nations pillars deep and lift them to the sky.

جانے کے بعد بھی اگر کسی مملکت کا ’’اساسی نظریہ‘‘تک زیر بحث چلا آرہا ہو اور دستور سازی ہنوز معرض بحث میں ہو بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ان دونوں کے بارے میں نئی نئی بحثیں اٹھ رہی ہوں اور ردّو قدح اور تکرار و نزاع کی نت نئی صورتیں پیدا ہورہی ہوں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ساری مادی ترقیوں اور معاشی منصوبہ بندیوں کے باوجود ابھی مملکت کی اصل تعمیر کی ابتدا بھی نہیں ہوئی اور قومی تعمیر نو کا کام شروع بھی نہیں ہوسکا۔

پاکستان کی زندگی کے بائیس سال درحقیقت گیارہ گیارہ سالوں کے دو مساوی ادوار پر مشتمل ہیں۔ پہلے گیارہ سالوں (۱۹۴۷ء تا۱۹۵۸ء)کے دوران پاکستان کے سیاست دانوں کی نااہلی وناقابلیت کا تدریجی ظہور ہوا اور اس کے اختتام کے قریب قطعی طور پر ثابت ہوگیا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور شخصیتیں اس عظیم مملکت کی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آہونے میں بالکل ناکام ہوچکی ہیں اور ان کے ہاتھوں اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے فطری نتیجے کے طور پر ۱۹۵۸ء میں انقلاب آیا جو بظاہر اور ابتداءً توفوجی تھا لیکن بہت جلد اس نے ایک سابق فوجی کے زیر سربراہی ایک خالص نوکر شاہی کی صورت اختیار کرلی اور اہل سیاست کو میدان سے ہٹا کر مملکت کے دوسرے منظم ادارے یعنی سول سروسز نے ملک کے نظم و نسق کو سنبھال لیا۔ چنانچہ دوسرا دور (۱۹۵۸ء تا۱۹۶۹ء)درحقیقت بیوروکریسی کا دور تھا اور اس کے دوران قوم کے اس دوسرے طبقے کی بھی بھرپور آزمائش ہوگئی۔ لیکن افسوس کہ اس دور کے بالکل ابتدا ہی سے ظاہر ہونا شروع ہوگیا تھا کہ قوم کا یہ طبقہ بھی دیانت و امانت اور احساسِ فرض کے ان اوصاف سے بہت حد تک عاری ہے جو اُس عظیم ذمہ داری کو کماحقہ ادا کرنے کے لیے لازمی ہیں جو اس کے کندھوں پر آپڑی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس طبقے کی نا اہلیت بھی واضح ہوتی چلی گئی اور۱۹۶۸ء کے اواخر میں بے اطمینانی کا وہ لاوا جو قوم کے مختلف طبقات میں اس طبقے کی دست درازیوں کے باعث کھول رہا تھا اچانک پھٹ پڑا‘ اور اس طرح یہ دور بھی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوگیا۔

ان دونوں طبقات کی ناکامی کے بعد ملک و ملت کے پاس ایک ہی منظم ادارہ باقی رہ گیا ہے یعنی فوج۔ چنانچہ بدرجۂ مجبوری پھر اسی کو آگے بڑھ کر ملک و ملت کی زمام اپنے ہاتھ میں لینی پڑی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ شرافت‘دیانت‘امانت‘حب وطن‘حب قوم‘ ایثار‘قربانی‘احساسِ فرض اور

تن دہی وجاں فشانی کے اوصاف کے اعتبار سے قوم اپنے اس طبقے پر مکمل اعتماد بھی کرتی ہے... لیکن ظاہر ہے کہ اس ادارے کا اصل فریضہ دفاع وطن ہے اوریہ بجائے خود اتنی عظیم ذمہ داری ہے کہ اس پر کوئی مزید بوجھ ڈالنا حد

درجہ ناانصافی ہے۔ بین الاقوامی حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کے پیش نظر مستقبل میں دفاعِ وطن کی ذمہ داری یقیناً پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھاری اور بوجھل ہوجائے گی اور ڈیفنس سروسز کے کندھوں پر اگر زیادہ دیر تک ملک کے داخلی نظم و نسق کا بوجھ بھی پڑا رہا تو اس سے دفاعِ وطن کے محاذ کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اور یہ خطرہ (risk) اتنا بڑا ہے کہ اسے کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف ملک کی سیاسی جماعتوں اور شخصیتوں کی صفوں میں خاصی سرگرمی اور ہلچل کے باوجود تا حال کوئی ایسی صورت سامنے نہیں آ رہی ہے کہ یہ امید کی جا سکے کہ اگر حکومت ان کے حوالے کردی جائے تو یہ اطمینان بخش طور پر اسے سنبھال سکیں گی اور دوبارہ وہی صورتحال پیدا نہ ہوجائے گی جس کے پیش نظر مارشل لاء کا نفاذ لازمی ہوگیا تھا۔

الغرض ‘نظریاتی اور دستوری بحثوں اور مناقشوں پر مستزاد یہ ہے وہ نازک صورت حال اور عظیم الجھاؤ (dilemma) جس سے مملکت خداداد پاکستان اس وقت دوچار ہے۔

اس صورتحال کے اسباب میں سے تین عوامل تو ہماری گزشتہ نصف صدی کی تاریخ سے متعلق ہیں اور تین پیچیدگیاں وہ ہیں جو قیام پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہوئیں اور مسلسل بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔

تاریخی عوامل کے بارے میں ہم ان صفحات میں مفصل لکھ چکے ہیں اور یہاں ان کے مفصل اعادے کی گنجائش بھی نہیں۔ مختصراً وہ یہ ہیں کہ:

اولاً...آج سے تقریباً نصف صدی قبل ملت اسلامیہ پاک و ہند کی قوتیں اور توانائیاں منقسم ہوگئیں اور قومی لائحہ عمل اور پالیسی سے اختلاف کی بنا پر علماء کا وہ طبقہ جو ماضی میں قوم کا اصل رہنما رہا تھا اور جس میں مخلص اور بے لوث عوامی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی‘ اپنے متوسلین سمیت قوم کے سوادِ اعظم سے کٹ کر رہ گیا اور اس طرح قوم اپنی بہترین متاع سے محروم

ہوگئی ۔ رہا یہ سوال کہ یہ حادثہ کیسے اور کیوں واقع ہوا‘تو یہ ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے جس پر گفتگو کی اس وقت گنجائش نہیں۔ (یہ تحریر اب ’’اسلام اور پاکستان‘‘نامی کتاب میں شامل ہے !)

ثانیاً ... اسلامیانِ ہند کی قومی قیادت قومی تعمیر نو اور قوم کی تنظیم و تربیت کے ضمن میں ہرگز کوئی قابل ذکر کام نہیں کرسکی۔ اب چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ اسے اس کا وقت نہیں ملا‘چاہے یہ کہ اس نے اس کی جانب توجہ نہیں کی‘فرق کوئی واقع نہیں ہوتا۔ واقعہ بہرحال یہی ہے کہ قومی تحریک نے بس ایک ہنگامی اور فوری سی ضرورت کو تو ضرور پورا کردیا لیکن اس نے قوم کو نہ کوئی قومی تنظیم دی نہ قومی قیادت !

ثالثاً ... قیامِ پاکستان سے تقریباً ایک دہائی قبل ایک اور صاحب نے ’’قومی تحریک‘‘کو مطعون کر کے ایک ’’بین الاقوامی اور خالص اصولی اسلامی تحریک‘‘کے نام پر قوم کے جسد سے مخلص کارکنوں کا ایک اور ٹکڑا کاٹ لیا

اور قیام پاکستان کے فوراً بعد اسی ''ٹکڑی'' کی مدد سے ''اسلامی دستور'' اور ''انقلابِ قیادت'' کے نعروں کے ساتھ قومی قیادت پر ایک زور دار شبخون مارا۔ نتیجتاً قومی قیادت کے رہے سہے مخلص عناصر کو قیام پاکستان کے فوراً بعد ایک جانب قومی تنظیم کے اندرونی خلفشار کا سامنا کرنا پڑا اور دوسری طرف ان صاحب کی بیرونی یلغار کا ۔ اس دو گونہ کشمکش نے قومی قیادت کے ان مخلص عناصر کو کمزور کرتے کرتے بالآخر میدان سے بالکل خارج (knock out) کر دیا اور میدان بالکلیہ ان لوگوں کے ہاتھ آگیا جن کا کوئی دین تھا تو خالص اغراض پرستی اور ایمان تھا تو محض مفادات پر اور جو کبھی یونینسٹ ہوتے تھے، کبھی لیگی۔ پھر کبھی ری پبلکن بن جاتے تھے اور کبھی پھر لیگی ! ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں پاکستان کی قومی سیاست کے تابوت میں وہ آخری کیل ٹھکی جس کے بعد خالص بیورو کریسی کا دور شروع ہوگیا۔ (ان تینوں امور پر ہماری مفصل تحریریں ''اسلام اور پاکستان'' نامی کتاب میں شامل ہیں)

ان تین تاریخی عوامل پر مستزاد ہیں وہ تین پیچیدگیاں جو قیام پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہوگئی تھیں اور گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہیں اور جن کا الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جارہا ہے۔ آئندہ ہم ان کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین پیچیدگی خالص جغرافیائی ہے یعنی یہ کہ مملکت خداداد پاکستان دو ایسے علیحدہ اور دُور دراز خطوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع ہوئے ہیں اور جن کے مابین ایک ایسی مملکت حائل ہے جو حالت جنگ ہی میں نہیں عین حالت امن میں بھی ایک بالقوہ دشمن (potential enemy) کی حیثیت رکھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یوں تو اگرچہ پاکستان کا وجود ہر اعتبار سے ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن خاص اس اعتبار ہی سے تو یہ تاریخ عالم کا ایک نہایت ہی انوکھا اور محیر العقول تجربہ ہے جس کی شاید ہی کوئی دوسری نظیر کبھی موجود رہی ہو۔

یہ جغرافیائی پیچیدگی بجائے خود بھی کچھ کم اہم اور الجھی ہوئی نہ تھی، لیکن دو مزید عوامل نے اس کے الجھاؤ کو دوگونہ کردیا ہے ۔ یعنی ایک اس حقیقت نے کہ تہذیب، تمدن، زبان، لباس، طرزِ بودوباش اور جذباتی و ذہنی ساخت غرض ایک مذہب کے سوا ہر اعتبار سے ان دو خطوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اگر دین و مذہب کے سوال کو خارج از بحث کردیا جائے تو دنیا کے مروجہ معیارات میں سے کسی معیار کے اعتبار سے بھی انہیں ایک قوم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دوسرے اس واقعے نے کہ ان دو خطوں میں سے جو خطہ رقبہ، محل وقوع، دفاع اور تعمیر و ترقی کے امکانات الغرض تمام اعتبارات سے اہم تر ہے وہ بلحاظ آبادی کم تر ہے اور دوسرا خطہ جو نہ صرف یہ کہ ان تمام اہم امور کے اعتبار سے بہرحال ثانوی حیثیت رکھتا ہے (۲)

، بلکہ ایک نہایت جاندار، فعال، سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ غرض ہر اعتبار سے نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے

اساسی نظریے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی اقلیت کی اضافی پیچیدگی بھی لیے ہوئے ہے تعدادِ نفوسِ انسانی کے لحاظ سے دوسرے خطے سے برتر ہے۔ ذرا دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دو اضافی عوامل کی بنا پر اس خالص جغرافیائی اشکال نے ایک نہایت پیچیدہ مسئلے کی صورت اختیار کرلی ہے۔

_____ (۱) ممکن ہے ہماری یہ عریاں حقیقت نگاری بعض لوگوں کو ناگوار معلوم ہو اور واقعہ یہ ہے کہ کوئی سیاسی کارکن اس حقیقت کے اظہار کی جرأت نہیں کرے گا' تاہم ہمارے نزدیک واقعہ یہی ہے اور اسے ذہنی طور پر قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

اور یہ اسی پیچیدگی اور اشکال کا نتیجہ ہے کہ بائیس سال کی طویل مدت میں بھی پاکستان کا کوئی دستور نہیں بن سکا اور دستور سازی کے میدان میں نہ صرف یہ کہ ہنوز روز اول کا معاملہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دُور دُور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جارہا ہے !

اس اشکال اور الجھاؤ کا مستقل حل تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل اُجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبہ کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائیدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا۔ تاہم فوری طور پر بعض دوسری چیزیں بھی پیش نظر رہنی ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اس ''سنجوگ'' کا برقرار رہنا مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی ہی پر منحصر ہے اور اسے کسی طرح بھی ان پر ٹھونسا نہیں جا سکتا' بلکہ اس معاملے میں جبر و تشدد کا رد عمل نہایت خوف ناک ہوسکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس ''آزاد مرضی'' کا انحصار بھی جتنا کچھ دینی جذبات اور ملی احساسات پر ہے اتنا ہی اس امر پر بھی ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ہمارے ساتھ کوئی نا انصافی نہیں ہو رہی بلکہ مثبت طور پر انہیں یہ احساس بھی ہو کہ خود ان کا مفاد مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے ہی سے وابستہ ہے اور مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ رہ کر ہی دنیا میں ایک باعزت اور باوقار آزاد مملکت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اگر خدانخواستہ کبھی ''علیحدگی'' کی صورت پیدا ہوئی تو مغربی پاکستان کے لیے تو پھر بھی امکانِ غالب موجود ہے کہ وہ اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھ سکے گا لیکن مشرقی پاکستان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ کسی دوسری وسیع تر قومیت میں ضم اور کسی دوسری بڑی مملکت میں جذب ہوکر رہ جائے۔

ان دو امور کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہیے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی مرضی دراصل ہے کیا ! اگر وہ واقعتا مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا

لی کوئی طاقت ان کی اس خواہش کے آڑے نہیں آ سکتی۔ بین الانسانی علائق میں سب سے زیادہ مقدس رشتہ میاں اور بیوی کا ہوتا ہے لیکن اس میں بھی دین

فطرت نے علیحدگی کی ایک سبیل رکھ دی ہے اور صاف ہدایت کی ہے اگرچہ طلاق حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے تا ہم ''معلق'' رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ علیحدگی اختیار کر لی جائے ۔بالکل اسی طرح اگر ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی واقعتاً یہ محسوس کرتے ہوں کہ مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے میں انہیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے تو ان کی بے اطمینانی کے سبب سے پورے ملک کی سیاسی و دستوری زندگی کو مسلسل ''معطل'' رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کی مرضی کو بروئے کار آنے کا موقع دیا جائے۔

ہم نے اوپر بھی عرض کیا تھا' اور اب مزید وضاحت سے کہے دیتے ہیں کہ مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین ''مساوات'' کا مفہوم اگر یہ ہے کہ دار الحکومت ایک مغربی پاکستان میں ہو اور دوسرا مشرقی پاکستان میں اور مرکزی حکومت چھ ماہ وہاں رہے اور چھ ماہ یہاں' اور دفاعی اخراجات میں بھی لازماً کامل مساوات برتی جائے تو یہ خالص احمقانہ تصور ہے۔ ایسی مساوات خاندان کے مختصر سے ادارے میں بھی نہیں چل سکتی' کجا یہ کہ ایک عظیم مملکت جو طرح طرح کی پیچیدگیوں سے دو چار ہو' اس کے انتظام و انصرام میں برتی جا سکے۔ اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ دونوں خطے آزاد ہو کر اپنے اپنے بقا و استحکام اور تعمیر و ترقی کی فکر کریں۔

لیکن ہمیں یقین ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی خواہش ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مغربی پاکستان سے علیحدہ ہوں۔ اگرچہ ماضی قریب میں ان پر یہ ''بہتان'' کثرت سے لگایا گیا ہے کہ ان میں ''علیحدگی پسندی'' کا رجحان موجود ہے' ہم یہ باور نہیں کر سکتے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان حقائق و واقعات اور موجود الوقت ظروف و احوال سے اتنے بے خبر ہو سکتے ہیں کہ ان خطرات کا اندازہ نہ کر سکیں جو ایسی کسی تجویز میں لازماً مضمر ہیں۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ بس ''صوبائی خود اختیاری'' کے حصول کی خواہش ہے اور وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ صوبائی معاملات میں انہیں زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو ۔ یہ ہمارے نزدیک ان کا ایک ایسا حق ہے جس سے کسی بھی معقول انسان کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا' اور مرکزی حکومت کے مؤثر طور پر اپنے فرائض سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے جو امور ضروری ہیں انہیں مرکز کی تحویل میں دینے کے بعد بقیہ تمام معاملات میں مشرقی پاکستان کو کامل صوبائی خود اختیاری لازماً ملنی چاہیے۔

انہی متذکرہ بالا دو امور کی روشنی میں دستور کے مسئلے پر بھی ایک بار حتمی طور پر فیصلہ کر لینے

لی شدید ضرورت ہے اور تمام حالات و واقعات کا مردانہ وار مواجہہ کرکے اس مسئلے کو ایک بار قطعی طور پر طے کرلینا لازمی ہے۔ اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جن کے نزدیک کسی مملکت کے انتظام و انصرام میں اصل فیصلہ کن عامل کی حیثیت دیانت و امانت کو حاصل ہے نہ کہ قواعد و ضوابط اور تدابیر تحدید و توازن (checks and balances) کے اس بے جان ڈھانچے کو جسے ''دستور'' کہاجاتا ہے تاہم ہمارے یہاں جو خلا اس میدان میں چلا آ رہا ہے اسے ایک بار جرأت و ہمت کے ساتھ عوام کی آزادانہ رائے کے مطابق پر کرلینا ہی بہتر ہے!

دستور کے مسئلے پر ہمارے یہاں اس وقت بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں۔ بہت سے لوگ ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی کے خواہاں ہیں' اگرچہ وہ ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر رہے ہیں کہ اس میں بنیادی ترمیموں کی ضرورت ہے اور اگرچہ خان قیوم خان نے ایک علیحدہ آواز بلند کی ہے یعنی یہ کہ فی الحال ایک عبوری دستور نافذ کردیا جائے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''دائیں بازو'' نے اپنے حلقہ اثر کی تمام جماعتوں اور شخصیتوں کو اس معاملے میں تقریباً متفق کرلیا ہے(جس کی تازہ ترین مثال شیخ مجیب الرحمن کا بھی ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی سے متفق ہوجانا ہے)۔دوسری طرف ایک مطالبہ یہ ہے کہ بالغِ حق رائے دہی کی بنیاد پر ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں آئے اور اسے ایک معین مدت (مثلاً چھ ماہ) کے اندر اندر دستور سازی کا پابند کیا جائے۔ بعد میں یہی اسمبلی پارلیمنٹ کی حیثیت سے کام کرسکتی ہے۔

ہمارے نزدیک یہی دوسری رائے منطق کے ہر اصول کے مطابق اقرب الی الصواب ہے اور اگرچہ ہمیں' جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا' ۱۹۵۶ء کے دستور سے بھی کوئی کد نہیں' تاہم ہمارے نزدیک حقیقت یہی ہے کہ ہمارے یہاں اب تک کی کسی دستوری دستاویز کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی پشت پر عوام کی مرضی اور رائے موجود ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی آئندہ انتخابات کی بنیاد بنایا گیا' تو یہ اعتراض جائز طور پر موجود رہے گا کہ ایک غیر نمائندہ دستور کے تحت منعقد شدہ انتخابات کے نتائج بھی قابل اعتماد نہیں قرار دیے جا سکتے۔ ہمارے نزدیک صدرِ مملکت محمد یحییٰ خاں کی وہ رائے نہایت صحیح ہے جو انہوں نے خان قیوم خاں کی متذکرہ بالا تجویز کے جواب میں ظاہر کی ہے' یعنی یہ کہ موجودہ مارشل لاء خود ایک ''عبوری دستور'' کی ضرورت پوری کر رہا ہے۔ اب اس معاملے میں جو اقدام بھی ہو وہ عارضی اور عبوری اور پیشگی طور پر واجب

الترمیم نوعیت کا نہیں ہونا چاہیے بلکہ ضرورت ہے کہ اس مسئلے کو ایک بار قطعی طور پر طے کرلیا جائے' اور ظاہر ہے کہ اس کی کوئی صورت اس مؤخر الذکر تجویز کے سوا ممکن نہیں۔

دوسری بڑی پیچیدگی جو گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہے اور روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے یہ ہے کہ اپنے اول یوم پیدائش ہی سے پاکستان کو ایک ایسی مملکت کی عداوت و دشمنی کا سامنا ہے جو ایک طرف تو نہ صرف

یہ کہ اس کے بالکل قریبی ہمسائے کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ پاکستان کے دونوں خطوں کے مابین حائل ہونے کی بنا پر گویا پاکستان کے چھوٹے سے جسم میں ایک بہت بڑے خنجر کی طرح پیوست ہے' اور دوسری طرف اپنی وسعت' قوت' آبادی اور وسائل تمام اعتبارات سے پاکستان سے کم از کم چوگنی ہے۔(۳)

بھارت کی یہ مستقل عداوت نہ صرف یہ کہ ہمارے محدود وسائل و ذرائع پر ایک بہت بڑے بوجھ کا سبب بنی رہی ہے جس کی بناپر اس نوزائیدہ مملکت کی تعمیر و ترقی کے جملہ امکانات بروئے کار نہ آسکے...بلکہ بد قسمتی سے اسی ایک مرکز کے گرد ہماری پوری خارجہ حکمت عملی کو ہمیشہ گھومنا پڑا ہے۔

اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو گزشتہ بائیس سالوں کے دوران دو دور گزر چکے ہیں اور اب تیسرے دور کا آغاز ہورہا ہے۔ پہلا دور آرام و آسائش بلکہ عیش اور گلچھروں کا دور تھا۔ دوسرے میں ہمیں نسبتاً مشکل تر حالات کا سامنا کرنا پڑا اور اب جو دور شروع ہورہا ہے' آثار و قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ہمیں اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے نہایت شدید جدوجہد اور محنت و مشقت کا سامنا کرنا ہوگا۔

_____ (۳) اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بھارت اور اسرائیل میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں دنیا کے نقشے پر اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے بالکل خنجروں سے مشابہ ہیں۔ ایک بلادِ عرب کے سینے میں پیوست ہے اور دوسرا اسلامیانِ پاکستان کے جسد میں۔ بلادِعرب اگر وسعت میں زیادہ ہیںتو اسلامیانِ پاکستان تعداد میں مسلمانانِ عرب کی مجموعی تعداد سے بھی کئی گنا زیادہ ہیں۔ اسرائیل بھارت کے مقابلے میں چاہے بہت چھوٹا ہے لیکن مغربی استعمار کی پشت پناہی کی بنا پر بھارت سے کسی طرح بھی کمزور نہیں!

پہلے دور میں دنیا کی بڑی طاقتیں دو دھڑوں میں منقسم تھیں۔ ایک طرف روس اور چین پر مشتمل کمیونسٹ بلاک تھا اور دوسری طرف اینگلو امریکی اتحاد۔ ان کے مابین شدید کش مکش اور مسلسل جنگ جاری تھی جو کبھی گرم ہوجاتی تھی کبھی سرد۔ بھارت نے ایک نئی طاقت کی حیثیت سے ان کے مابین ''ثالثی'' کا کردار اختیار کرنے کی کوشش کی اور اپنی نام نہاد آزاد اور غیر جانب دار خارجہ پالیسی کے نام پر خصوصاً مغربی بلاک کو پریشان کرنا شروع کیا۔ اس صورت حال کا عروج تھا وہ وقت جب ہندوستان میں ''ہندی چینی بھائی بھائی'' کے نعرے لگ رہے تھے۔ اس وقت مغربی بلاک کو شدید ضرورت تھی کہ اس علاقے میں کوئی ملک ایسا ہو جہاں اس کے قدم بھی کسی قدر جم سکیں۔ ان کی اس ضرورت کو اپنی خارجہ حکمت عملی میں فٹ پا کر پاکستان نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ یہ وہ دور تھا جب ہم پر چچا سام نہایت مہربان تھے اور ہمارے ہر طرح کے ناز نخرے برداشت کرنے کو تیار تھے! دوسری طرف ہم بھی ان کے کامل نیاز مند تھے اور ان کے اشارے پر کبھی سیٹو میں حاضری دیتے تھے کبھی سنٹو میں!

اس کے بعد حالات بدلے۔ ایک طرف چین اور روس کے مابین اختلافات کی خلیج نمودار

ہوئی‘ دوسری طرف روس کا رویہ مغربی اتحاد کے ساتھ بدلنا شروع ہوا‘ تیسری طرف بھارت کو ’’عقل‘‘ آئی اور اس نے اندر ہی اندر چچا سام سے تعلقات استوار کر لیے‘ اور چوتھی طرف روس‘ مغربی اتحاد اور بھارت تینوں نے چین کو اپنے مشترک دشمن کی حیثیت دینی شروع کر دی ۔ نتیجتاً بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ حکمت عملی کے میدان میں ہم نے جس زمین پر تعمیر کی تھی وہ پیروں تلے سے کھسکنی شروع ہو گئی اور بھارت کو امریکہ اور روس دونوں کے منظورِ نظر کی حیثیت حاصل ہو گئی ۔ یہ ہمارے لیے مشکلات کے دور کا آغاز تھا۔ اس دور کے بالکل ابتدا میں ایک کوشش امریکہ نے یہ کی بھی کہ کسی طرح بھارت اور پاکستان کے مابین ایسی مکمل ’’مفاہمت‘‘ کرا دی جائے کہ یہ دونوں سوکنوں کی بجائے بہنوں کی صورت اختیار کر لیں اور دونوں ہمارے اشاروں پر یکساں حرکت کر سکیں۔ اس غرض سے اس نے پنجاب کے دریاؤں کے پانی کے مسئلے کو جیسے تیسے حل کرانے کا کھکھیڑ مول لیا اور بعض دوسرے معاملات میں بھی صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کوششوں کا عروج (climax) تھی وہ تجویز جو امریکہ نے سابق صدر ایوب کے ذریعے پیش کرائی کہ پاکستان اور ہندوستان کا دفاع مشترک ہو جائے۔ اس تجویز

پر پنڈت نہرو کے احمقانہ رد عمل سے اس معاملے میں اینٹی کلائمکس کے دور کا آغاز ہوا اور پاکستان میں آزاد خارجہ حکمت عملی کا دور شروع ہو گیا۔

اب ظاہر ہے کہ کسی کے گھڑے کی مچھلی بنے رہنے میں جو آسانی اور عافیت ہے وہ اپنی آزاد رائے اور آزادانہ حیثیت و تشخص کو برقرار رکھنے اور دوسروں سے منوانے (یعنی assert کرنے)میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ آزادی بہرحال جدوجہد‘ محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کا مطالبہ کرتی ہے۔ چنانچہ اس دور میں ہمیں لامحالہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔

اب جس تیسرے دور کا آغاز ہو رہا ہے‘ وہ اسی صورت حال کی گویا ایک منطقی انتہا کا دور ہے۔ اس وقت جن حالات سے ہم دو چار ہیں وہ یہ ہیں کہ ایک طرف صاحب برطانیہ بہادر تو بالکل ہی اپنی بساط مشرق سے لپیٹ گئے ہیں‘ خود چچا سام بھی پہلے کوریا اور پھر ویت نام میں اس قدر مار کھا چکے ہیں کہ اب اس علاقے سے کسی قدر باعزت طور پر کھسک جانے ہی میں عافیت محسوس کر رہے ہیں۔ دوسری طرف روس نے امریکہ کی خاموش رضا کے تحت اس علاقے میں کچھ زیادہ ہی پاؤں پسارنے شروع کر دیے ہیں اور تیسرے جنوب مشرقی ایشیا میں ان دونوں کا اصل اتحادی بھارت اور اصل دشمن چین بن چکا ہے۔ اب امریکہ‘ روس اور بھارت تینوں مل کر زور لگا رہے ہیں کہ ہم ان کے تابع مہمل بن کر ان کی مرضی کے مطابق چین کی مخالفت میں ان کا پسندیدہ کردار ادا کریں اور اس علاقے میں بھارت کے مقابلے میں گھٹیا درجے کی شہریت (second rate citizenship) قبول کر لیں۔ اس طرح یہ دور ہماری قومی غیرت اور حمیت کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بن کر شروع ہو رہا ہے اور اس کے لیے ہم پر ہر

ممکن دباؤ کو استعمال کرنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف بھارت نے ایران اور عرب ممالک میں اپنے تجارتی و صنعتی اثر و رسوخ کے جال کو تیزی کے ساتھ بچھانا شروع کردیا ہے اور یہ امر ہمیں ہوشیار کرنے کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ ان ممالک کی جانب سے بھارت کے ان عزائم کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے۔ دوسری طرف بھارت نے افغانستان سے اپنے پرانے معاشقے کی از سر نو تازہ جوش وخروش کے ساتھ تجدید کرنی شروع کردی ہے اور ایک فراخہ بند سے جو خطرہ مشرقی پاکستان کی زرعی معیشت کو تھا' اس کا حل بھی ابھی نہیں ہوا تھا کہ افغانستان سے آنے والے دریاؤں کو خشک کرکے مغربی

پاکستان کی معیشت پر خطرناک وار کرنے کی سکیم پر سوچ بچار شروع ہوگیا ہے۔ تیسری طرف خاص اس موقع پر سرحدی گاندھی سے اندرا گاندھی کی ملاقات' انہیں ''نہرو پرائز'' وصول کرنے کے لیے بھارت آنے کی دعوت اور ان کی خدمت میں اسی لاکھ روپے کی رقم بطورِ نذرانہ پیش کرنے کی سکیم سے بھارت کے عزائم واضح طور پر سامنے آ رہے ہیں۔ بھارت کی ان ساری کوششوں اور تدبیروں پر مستزاد ہیں روس کی تجاویز جو کبھی کوسیجن صاحب کے پیش کردہ معاشی تعاون کے منصوبے کی صورت میں سامنے آتی ہیں اور کبھی برزنیف صاحب کی پیش کردہ ''اجتماعی سلامتی'' کی سکیم کی شکل اختیار کرتی ہیں' اور ان سب پر ثبت ہے چچا سام کی منظوری و رضا مندی کی مہر جو ایسی تمام تجاویز پر خاموشی یا ''محتاط ردِّ عمل'' کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

یہ صورت حال ہر غیور اور باحمیت پاکستانی سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ کمر ہمت کس کر حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد ہوجائے۔ اس مشکل کے وقت میں ہماری اصل قوتِ مدافعت و مزاحمت ایک آزاد اور باعزت و باوقار ملک و ملت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے ایک شدید داعیے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے' اور یہ داعیہ محض ''زندگی برائے زندگی'' کے نظریے سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس نظریے کے تحت تو انسان بسا اوقات ذلت اور بے عزتی کی حالت کو بھی گوارا کرلیتا ہے۔ یہ داعیہ کسی مقصد زندگی سے آشنا ہوکر ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ ملت اسلامیہ پاکستان کے اندر اگر کسی مقصد کا عشق پیدا ہوجائے اور یہ انسانیت کے لیے کسی نظریے اور پیغام کی علمبردار بن کر اٹھ سکے تبھی اس یہوہ ہمت' وہ جرأت' وہ ایثار' وہ قربانی اور محنت و مشقت کا وہ جذبہ بیدار ہو سکتا ہے جو ان حالات میں اس کے بقا و تحفظ ہی نہیں ترقی و استحکام اور عزت و وجاہت کا ضامن بھی بن سکتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ نظریہ وہی ہوسکتا ہے جس کے نام پر پاکستان قائم ہوا تھا اور وہ پیغام اسلام کے پیغام کے سوا اور کوئی نہیں۔ گویا جس طرح پہلی پیچیدگی کا اصل اور مستقل حل دینی جذبات اور ملی احساسات کو اجاگر کرنے میں ہے' اسی طرح اس دوسری پیچیدگی اور اشکال کا اصل حل اور اس سے پیدا شدہ چیلنج کا اصل جواب بھی یہی ہے کہ ہم بحیثیت قوم ایمان کے داعی اور اسلام کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں اور اس مقصد کے ساتھ ایک ایسا والہانہ عشق ہمارے

اندرپیدا ہوجائے کہ اس کے لیے بڑی سی بڑی محنت اور کٹھن سے کٹھن مشقت ہمیں آسان معلوم ہونے لگے اور بڑے سے بڑا ایثار اور اونچی سے اونچی قربانی حقیر محسوس ہو۔

74

اس پیچیدہ صورت حال کا ایک ضمنی تقاضا بھی ہے اور وہ یہ کہ ہماری خارجہ حکمت عملی کو اب دورِ ثانی کے مقابلے میں بھی زیادہ ''آزاد'' ہونا چاہیے اور اندریں حالات ہمیں عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ اپنے تعلقات پر پہلے سے بھی زیادہ زور دینا چاہیے۔ چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ اس موقع پر ایک طرف ''دائیں بازو'' کی چوٹی کی قیادت (top brass) نے بھی اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں چین کی مخالفت میں بڑی طاقتوں (سپر پاورز) کا آلہ کار ہرگز نہیں بننا چاہیے اور دوسری طرف وزیر اعظم روس کے دہلی سے واپسی پر ''سر راہے'' ورودِ پاکستان اور اب صدرِ امریکہ کی خلائی جہاز کی واپسی کے منظر کو دیکھنے کے بعد ٹہلتے ٹہلاتے پاکستان کو بھی نوازتے جانے کے پروگرام سے یہ احساس شدت کے ساتھ ابھرا ہے کہ عوامی جمہوریہ چین کے وزیر اعظم چو این لائی کو بھی جلد پاکستان آنا چاہیے (جس کا سب سے بڑا مظہر آج ۵ جولائی کے اخبارات میں شائع شدہ صدرِ مملکت محمد یحییٰ خاں کا یہ بیان ہے کہ چو این لائی عنقریب پاکستان کا دورہ کریں گے)۔

نہ صرف یہ 'بلکہ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں پاکستان کو روس' امریکہ اور بھارت کے اتحادِ ثلاثہ کے احمقانہ دباؤ کے تحت کچھ زیادہ ہی تیزی کے ساتھ چین کی جانب جھکنا ہوگا اور یہ حالات کا ایک ایسا بہاؤ ہوگا جس کے رخ کو روکنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں رہے گا۔

* * *

75

باب چہارم
''حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!''

76

باب چہارم

''حیراں ہوں دل کو روؤں

کہ پیٹوں جگر کو میں !''

اکتوبر ۱۹۶۹ء

سالِ رواں کے اس ربع کے دوران میں جو واقعات عالمِ اسلامی میں رونما ہوئے اور جن حوادث کا سامنا اُمت مسلمہ کو رہا ' ان کی یاد سے کلیجہ شق ہوتا ہے۔ اتنے گوناگوں مصائب اور ایسے پے بہ پے حوادث کہ انسان حیران و پریشان ہوکر رہ جائے کہ ع

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں !

ایک طرف مسجد اقصیٰ کو نذرِ آتش کیا گیا اور عالم اسلامی کے روحانی مراکز میں سے تیسرا عظیم ترین مرکز' حرمِ ثالث اور ان تین مقدس ترین مقامات میں سے ثالث ثلاثہ جن کی زیارت کی نیت سے شد رحال کی آنحضور ﷺ نے اجازت دی ہے' آگ کے شعلوں میں لپٹ کر پورے عالم اسلام کے لیے مجسم دعوتِ آہ و فغاں بن گیا ۔ ؎

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

پورا عالم اسلام بے قرار ہوگیا' قلوب مضطرب ہوگئے' روحیں بے چین ہوگئیں' غم و اندوہ اور غیظ و غضب کی ایک لہر پوری ملت اسلامی کے جسد میں دوڑ گئی لیکن آخرش ''قہر درویش بر جان درویش'' کے سوا کچھ نہ ہوسکا۔ پوری ملت اسلامی بس تلملا کر رہ گئی۔ اس لیے کہ ع

''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات''۔

جس طرح بسا اوقات کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلینے ہی میں عافیت دیکھتا ہے اسی طرح جی چاہتا ہے کہ اس صورت حال کے عواقب سے بھی آنکھیں بند کرلی جائیں اور قطعاً نہ سوچا جائے کہ یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا ! بصورت دیگر سخت مایوسی کا سامنا ہوتا ہے' اعصاب جواب دینے لگتے ہیں اور نبضیں چھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔ دشمن ہمیں ٹٹول رہا ہے اور رفتہ رفتہ

ہماری کمزوریوں سے آگاہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ صورت حال یک دم تبدیل ہوگئی ہے‘اور دفعۃً عالم ارضی کی پوری نام نہاد ملت اسلامی کا بھرم کھل گیا ہے۔ ابھی تک معاملہ صرف فلسطینی عربوں کے حقوق کا تھاجسے خود عربوں نے سخت ناعاقبت اندیشی سے کام لے کر اپنا ایک داخلی سا مسئلہ بنا رکھا تھا‘لیکن اب معاملہ پوری ملت اسلامیہ کی دینی غیرت و حمیت کا ہے۔ اس ذلت کو اگر یہ پوری امت اس طرح گوارا کر گئی تو دشمن حرمِ نبویؐ کی حرمت پر وار کرنے سے کب باز رہے گا؟ آج کے دور میں جبکہ لاکھوں میل کے فاصلے کی بھی کوئی وقعت نہیں رہی‘اسرائیل کی موجودہ سرحدوں سے مسجد نبوی کا فاصلہ کل چھ سو میل اور مسجد حرام کا فاصلہ قریباً آٹھ سو میل رہ گیا ہے... اور کم از کم حرمِ نبویؐ پر اپنے دعویٰ استحقاق کو تو اسرائیل نے کبھی مخفی بھی نہیں رکھا۔ ادھر قرآن حکیم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمان امتوں کو ان کی بد عملی و بدکرداری کی سزا ان کے مقاماتِ مقدسہ کی اغیار کے ہاتھوں بے حرمتی کی صورت میں بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ ماضی کی اُمت ِمسلمہ یعنی بنی اسرائیل کو یہ سزا دوبار دی گئی :

{فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ لِيَسُوۡٓءٗا وُجُوۡهَكُمۡ وَ لِيَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِيۡرًا ﴿۷﴾} (بنی اسرائیل)

’’پھر جب آیا دوسری وعید کا وقت (تو مسلط کیا تم پر لوگوں کو)تاکہ بگاڑ دیں وہ تمہارا حلیہ اور داخل ہوں مسجد میں اسی طرح جس طرح داخل ہوئے تھے اس میں پہلی بار اور تباہ کردیں ہر چیز کو جس پر بھی بس چل جائے !‘‘

تو کیا اب ہماری سیہ کاریوں کی کالک حرمین شریفین کی مقدس پیشانیوں پر بھی ملی جائے گی ! عیاذًا باللہ اعیاذًا باللہ!!

دوسری طرف بھارت میں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی‘ اور تاحال یہ شغل جاری ہے !یوں تو ہندی مسلمانوں پر ظلم و تشدد اور تعدی وعدوان بھارت کی ہندوجاتی کا روز کا معمول ہے لیکن احمد آباد اور اس کے گرد و نواح میں تو ان دنوں بالکل ۱۹۴۷ء کی خونچکاں داستان دہرائی گئی اور بعینہٖ وہی نقشہ سامنے آگیا کہ ع ’’ہوگیا مانند آب ارزاں مسلمان کا لہو!‘‘

اللہ کی شان ہے کہ جو شہر خود احمد مجتبیٰ ﷺ کے نامِ نامی سے معنون ہو‘اس میں انؐ ہی کے دین کے نام لیوا اس طرح بھیڑ بکریوں کے مانند ذبح ہو رہے ہیں اور پورا عالم اسلام ہے کہ ’’ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم‘‘کا نقشہ پیش کررہا ہے‘ درآنحالیکہ کتابِ الٰہی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ :

{وَ مَا لَكُمۡ لَا تُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَ الۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الۡوِلۡدَانِ الَّذِيۡنَ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَخۡرِجۡنَا مِنۡ هٰذِهِ الۡقَرۡيَةِ الظَّالِمِ اَهۡلُهَا ۚ وَ اجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا ۚ وَّ اجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ نَصِيۡرًا ﴿۷۵﴾} (النساء)

’’اور تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم جنگ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں اور ان مغلوب و مقہور مردوں‘عورتوں اور

بچوں (کی داد رسی) کے لیے جو کہتے ہیں کہ: اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں' اور ہمارے لیے اپنی جانب سے کوئی حمایتی اور مددگار اٹھا!''

اس معاملے میں یوں تو اس عالم ارضی کی پوری امت مسلمہ کی ملی غیرت و حمیت کا مرثیہ کہنا چاہیے' خصوصاً اس لیے کہ یہ ایک ناقابل انکار واقعہ ہے کہ بر صغیر پاک و ہند کی ملت اسلامی نے ہمیشہ پورے عالم اسلامی کے رنج و غم کو اپنا دکھ درد شمار کیا اور تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ صورت حال یہ رہی کہ چاہے کبھی بلقان و ترکی پر برا وقت آیا ہو' چاہے طرابلس و شام پر' ہندوستانی مسلمان بالکل اس طرح تڑپ اٹھتا رہا جیسے خود اس کے پہلو میں خنجر بھونکا گیا ہو۔ ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

لیکن ادھر یہ عالم ہے کہ بھارت میں ''فی کل عام مرۃ او مرتین'' مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے' اور عالم اسلام ... بات کہنے کی نہیں لیکن ع
''خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے''

کے مصداق کہنی پڑتی ہے کہ ... خصوصاً عالم عرب کا حال یہ ہے کہ ان کی ہر حکومت بھارت کی نیاز مندی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے اور اسے سر آنکھوں پر بٹھانے کے لیے ایک دوسرے سے زیادہ بے تاب نظر آتی ہے۔ ماضی میں پنڈت نہرو کو عین مملکت عربیہ سعودیہ میں حرمین شریفین کی خادم و محافظ حکومت نے ''رسول السلام'' کے خطاب سے نوازا

اور اس موقع پر تو حد ہوگئی کہ عین اس وقت جبکہ بھارت کے ایک صوبائی دار الحکومت میں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا اور گھاس پھونس کی طرح جلایا جارہا تھا' زعمائے عرب رباط کی مسلم سربراہ کانفرنس میں بھارت کی شرکت پر زور دے رہے تھے اور اس معاملے میں ان کی صفوں میں ایک غیر معمولی اتحاد و اتفاق نظر آرہا تھا حتیٰ کہ اس حمام میں ''رجعت پسند شاہ پرست'' اور نام نہاد ''ترقی پسند'' سب یکساں ننگے تھے۔ ؎

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے

عالم اسلام اور خصوصاً عالم عرب سے یہ گلہ شکوہ قدرے دور کی بات سہی، لیکن ملت اسلامیہ پاکستان کے لیے تو یہ واقعتاً ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ وہ جن کی قربانیوں کے طفیل آج نہ صرف یہ کہ آزادی کے سانس لے رہی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ گلچھرے اڑا رہی ہے ان پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھ کر بھی یہ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ خدا کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں اور مکافاتِ عمل صرف عالمِ آخرت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اقوام و ملل کے اجتماعی جرائم کا حساب تو اکثر و بیشتر یہیں چکا دیا جاتا ہے۔ ہمارے لچھن اگر وہی رہے کہ جو اب ہیں اور ہم اسی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے خون کی سرخی کو شرابِ ارغوانی اور غازۂ چہرۂ نسوانی میں تبدیل کرتے رہے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا!

کم از کم ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم ہندی مسلمانوں پر ظلم و ستم کی اس پیہم یلغار کو اسی طرح خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہے اور ہماری رگِ حمیت صرف اسی قدر جوش کھاتی رہی کہ ہر بار ظالموں کی اس منڈلی کی دہائی دی جاتی رہی جسے اقوامِ متحدہ کہا جاتا ہے تو رفتہ رفتہ ہماری حمیت قومی اور غیرتِ ملی کا جنازہ بالکل نکل جائے گا اور وہ وقت زیادہ دور نہیں جب صورت وہ ہوجائے گی کہ ع:

حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

پھر تاریخ کی یہ شہادت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس گھرانے سے غیرت و حمیت رخصت ہوجائے، اس سے آزادی اور خود اختیاری کو بھی روانہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجامِ بد سے بچائے! آمین۔

اندرونِ ملک کے حالات کو دیکھئے تو مزید مایوس کن صورت حال نظر آتی ہے اور ع

''تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم''

کا نقشہ دکھائی دیتا ہے، یہاں تک کہ اوپر کا سارا گلہ شکوہ ہی بے بنیاد نظر آنے لگتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سارا ''استغاثہ'' تو صرف ''ملت اسلامیہ'' کے نام مناسب ہوسکتا ہے اور یہاں یہ تصور ہی کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم کے درجے کو پہنچ چکا ہے ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!

چنانچہ جس قسم کے نعرے آج سے پچیس تیس سال قبل عالم عرب میں لگے تھے یعنی ''المصر للمصریین'' (مصر مصریوں کا ہے) اسی قسم کے نعرے آج سرزمینِ پاک میں بلند ہو رہے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں تو بنگالی قومیت کا راگ شروع ہی سے الاپا جارہا تھا۔ اب سندھ بھی ''جئے سندھ'' کے نعروں سے گونج رہا ہے اور یہی حال بلوچستان اور سابق صوبۂ سرحد کا ہے۔ وہاں پختونستان کا سٹنٹ تو قدیم تھا ہی' ایک نئی دو عملی یہ ایجاد ہوئی ہے کہ ''عظیم باپ'' افغانستان میں بیٹھ کر آزاد پختونستان کے نعرے کو ہوا دے رہا ہے اور اس کی صلبی و معنوی ذریت پاکستان میں بیٹھ کر اس کی ایک دوسری نسبتاً کم قابل اعتراض تعبیر پیش کر رہی ہے۔ الغرض وہ نغمہ کہ:

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
کہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی!

جو تحریک پاکستان کے دوران خوب زور شور سے بلند ہوا تھا' ایران و افغانستان تک کیا پہنچتا خود پاکستان میں دم توڑ رہا ہے (۱)

۔ پوری ارض پاک میں ایک خطہ پنجاب ہے جو شاید اپنے اس مایہ ناز _____ (۱) خود ہم نے جولائی کے شمارے میں پاکستان کی اجتماعی زندگی کی جن الجھنوں اور پیچیدگیوں کا تذکرہ کیا تھا ان میں سے تیسری الجھن جو مضمون کی دوسری قسط میں بیان ہوئی تھی یہی ہے کہ پاکستان میں ''قومیت'' کا ایک ہولناک خلا ہے جو کوئی آج پیدا نہیں ہوا بلکہ ابتدا سے چلا آرہا ہے' لیکن بعد میں ہم نے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے اس لیے احتراز کیا کہ ع ''اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں!'' سردست صرف اس اشارے پر اکتفا مناسب ہے کہ پاکستان قائم تو ''ملت از وطن است'' کی پرزور نفی اور ''ملت اسلامی'' کے تصور کے زوردار اثبات پر ہوا تھا' لیکن خود اس کے قائم کرنے والے نے پہلے ہی روز غیر مبہم الفاظ میں یہ کہہ کر کہ ''پاکستان میں نہ کوئی ہندو ہندو رہے گا نہ مسلمان مسلمان' مذہبی اعتبار سے نہیں' اس لیے کہ وہ تو ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے لیکن سیاسی اعتبار سے...!'' ملت اسلامی کے تصور کی نفی اور ''وطنی قومیت'' کا اثبات کر دیا تھا۔ چنانچہ اسی وقت سے ہمارے یہاں ''ملت اسلامی'' اور ''پاکستانی قومیت'' کے مابین ایک گھپلا جاری ہے۔ اور یہ اسی گھپلے کے ثمرات ہیں جو آج علاقائی و لسانی قومیتوں کے فروغ کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس لیے کہ نظریہ ملت کو خود ہم نے منہدم کر دیا اور پاکستانی قومیت کا تصور ہمارے مزاج کے مناسب نہ تھا۔ چنانچہ ہماری اجتماعی زندگی میں وہ خلا پیدا ہوا جو رفتہ رفتہ متذکرہ بالا قومیتوں اور عصبیتوں سے پر ہوا۔ چنانچہ اب شکایت ہو تو کس سے اور گلہ ہو تو کس کا؟ کہ ع ''اے بادصبا ایں ہمہ آوردۂ تست!'' اگرچہ یہ اندیشہ بھی شدید ہے کہ بات کہیں ''حدود'' سے تجاوز نہ کر جائے' لیکن دردِ دل

بالکل خاموش بھی نہیں رہنے دیتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ''مبینہ'' الفاظ پر تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور آج تک بھی ان کا قصور معاف نہیں ہوا' حالانکہ جب انہوں نے اپنے بیان کی وضاحت فرمائی تو علامہ نے بھی اپنے اشعار سے رجوع کر لیا تھا' لیکن بانی پاکستان کے اس نظریہ وطنیت پر تنقید کی جرأت کسی کو نہ ہوئی حتیٰ کہ علماء بھی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے ؎

دیکھ کعبے میں شکست رشتہ تسبیح شیخ !
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ !

81

سپوت کی لاج رکھنے کو جسے دنیا علامہ اقبال کے نام سے جانتی ہے' ''رجوع الی الجاھلیت ''کی اس وبا سے قدرے بچا ہوا ہے... لیکن تا بہ کے؟ اگر یہ ایک واقعی قانون فطرت ہے کہ ''ہر عمل ایک رد عمل کو جنم دیتا ہے'' تو جلد یا بدیر یہاں بھی وہی صورت پیدا ہو کر رہے گی۔

اس صورت حال میں ہندی مسلمانوں کی داد رسی کی توقع کس سے ہو؟ یہاں تو بنگالی مسلمان نے غیر بنگالی مسلمان کا خون بہانے سے دریغ نہ کیا۔ کوئٹے میں بارہا فسادات کی آگ بھڑکی اور سندھ کے متعدد شہروں میں غیر سندھی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا باقاعدہ پروگرام بن چکا تھا۔ یہ تو بھلا ہو مارشل لاء کا کہ بروقت نافذ ہوگیا ورنہ مغربی پاکستان بھی اس میدان میں مشرقی پاکستان کی ہمسری کا شرف حاصل کر لیتا۔

تشتّت و انتشار کی اس گرم بازاری میں مزید اضافہ دائیں اور بائیں بازو کی قوتوں کی ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی سے ہو گیا ہے۔چنانچہ دونوں کیمپوں میں ایک دوسرے سے نفرت اور بیزاری بڑھتی جا رہی ہے اور اشتعال میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے حتیٰ کہ تشدد اور تصادم اور

82

فیصلہ کن مقابلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور نوجوان ایک دوسرے پر پِل پڑنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔

رہی سہی کسر علمائے دیوبند کے دو متحارب گروہوں نے ایک دوسرے کے مقابل آکر پوری کردی ہے۔ ان کے مابین بغض حادث نہیں' قدیم ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصے تک ان کی صفوں میں اتحاد و اتفاق کے مظاہرے دیکھنے میں آئے تھے لیکن معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ ''تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى'' والا معاملہ تھا۔ چنانچہ جونہی دوبارہ اختلاف رونما ہوا' فضا ایک دم شرعی گالیوں سے معمور ہوگئی۔ بنائے نزاع ''سوشلزم''کو قرار دیا گیا ہے' در آنحالیکہ سرمایہ داری کے دونوں ہی گروہ یکساں مخالف ہیں اور مزدوروں اور کسانوں کی ''حالت زار'' کا دونوں ہی کو

برابر رنج و غم ہے۔ حتیٰ کہ معاشی عدل و اعتدال کے لیے فوری تدابیر میں بھی دونوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ بایں ہمہ کفر کے فتوے عام ہو رہے ہیں اور ''کانگرسی مولوی'' کی گالی میں تو خیر کوئی مضائقہ ہی نہیں ع
''بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است''

عجیب طرفہ تماشا ہے کہ ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح تو سرآنکھوں پر لیکن ''اسلامی سوشلزم'' کی اصطلاح قطعاً ناجائز و حرام۔ پھر مزید یہ کہ جس شخص نے سب سے پہلے یہ اصطلاح استعمال کی یعنی محمد علی جناح مرحوم وہ تو سب کے نزدیک قائد اعظم اور رحمۃ اللہ علیہ' لیکن اب جو بھی یہ لفظ منہ سے نکالے وہ کافر و مرتد۔ بحالی جمہوریت کے لیے تو ہر کس و ناکس سے تعاون کو جائز ہی نہیں لازمی و ناگزیر قرار دیا جائے لیکن معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کی غرض سے کوئی مزدوروں سے اتحاد کرلے تو گردن زدنی ٹھہرے ! ؎

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری !

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس تفرقہ و انتشار کا انجام کیا ہوگا اور ہماری قومی و ملی زندگی کس حادثے سے دوچار ہوگی۔ بظاہر احوال تو امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی !

باب پنجم

دائیں اور بائیں بازوؤں کی تقسیم
اور
CIVILIAN COUP DETAT

باب پنجم

دائیں اور بائیں بازوؤں کی تقسیم

اور

CIVILIAN

COUP DETAT

فروری ‘مارچ ۱۹۷۰ء

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی حکومت کو ختم ہوئے اور ملک میں دوسرا مارشل لاء نافذ ہوئے ابھی پورا ایک سال بھی نہیں ہوا‘ لیکن حالات اتنے بدل چکے ہیں اور ع ’’کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی‘‘ کا ایسا نقشہ بندھا ہے کہ موصوف کی حکومت ماضی بعید کا قصہ اور ازمنۂ قدیم کی داستان نظر آتی ہے۔ بالکل یقین نہیں آتا کہ ایک ہی سال قبل یہاں صدر ایوب ’’کوس لمن الملک‘‘ بجا رہے تھے‘ اور آنجہانی کنونشن مسلم لیگ ملک کی واحد فعال اور نمائندہ سیاسی جماعت ہونے کی مدعی تھی! کہاں آج یہ حال ہے کہ سابق صدر کو کارٹونوں میں سانپ کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے اور لیگ کے ٹٹو کے سر سے ’’کنونشن‘‘ کا سینگ ہی سرے سے غائب ہو چکا ہے۔ کتنا عظیم انقلاب ہے‘ اور {وَتِلۡکَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُہَا بَیۡنَ النَّاسِ ۚ} کی کیسی کامل تصویر!

عبرت کی جا ہے کہ وہی لوگ جو کل تک ایوب خان کے بوٹ کی ٹو چاٹنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں نظر آتے تھے‘ آج انہیں گالیوں سے نواز رہے ہیں۔ ؎

من تو شدم تو من شدی‘ من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ایسے لوگوں سے تو ہمیں کچھ نہیں کہنا‘ اس لیے کہ ان کا تو اپنا وجودِ نامسعود ہمارے نزدیک ملک و ملت کے ماتھے کا کلنک کا ٹیکہ ہے۔ سابق صدر کے دور اقتدار کے سیاسی مخالفین سے البتہ ہم یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اب انہیں کوسنا چھوڑ دیں‘ اس لیے کہ سیاسی میدان میں ان کی وفات واقع ہو چکی ہے اور ہمارے دین کی تعلیم یہی ہے

لہ ”اُذْکُرُوْا مَوْتَاکُمْ بِالْخَیْرِ!“ ان کا دور گزر گیا۔ او رکچھ انہوں نے کیا ‘عدالت اُخروی میں اس کا حساب کتاب ہوجائے گا۔

{تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَہَا مَا کَسَبَتْ وَ لَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿ ۱۳۴ ﴾} وہ کامیاب ہوئے یا ناکام‘ ان کا امتحان بہرحال ختم ہوچکا۔ اب امتحان آپ کا ہے‘ اپنی کامیابی کی فکر کیجیے ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے‘ تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

خصوصاً ان لوگوں پر تو اس وقت بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوگئی ہے جو سابق صدر کی ذات اور ان کی حکومت ہی کو ملک و ملت کے جملہ امراض وعلل کا سببِ واحد قرار دیتے تھے کہ اب جبکہ وہ میدان سیاست سے ہٹ گئے یا ہٹا دیے گئے تو منطقی طور پر انہیں جلداز جلد سب مسائل کو حل کرکے دکھا دینا چاہیے۔ ہماری بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس عظیم امتحان میں کامیابی عطا فرمائے۔

اس ایک سال کے عرصے میں پاکستان کی سیاسیات کا جو جدید نقشہ بنا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو ہم نے گزشتہ سال جنوری ‘فروری اور مارچ کے شماروں میں ”تذکرہ و تبصرہ“ کے صفحات میں کھینچا تھا۔ چنانچہ مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ مدیر ماہنامہ ”الفرقان“ لکھنؤ اپنے ایک حالیہ مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

”وہاں (پاکستان) سے کوئی اخبار‘ رسالہ‘ پرچہ پرزہ نہ آسکنے کی وجہ سے وہاں کے حالات سے مکمل بے خبری ہے۔ رمضان المبارک میں ہمارے مولانا بنوری مکہ معظمہ پہنچ گئے تھے۔ ان سے اس وقت تک کے حالات خاصی تفصیل سے معلوم ہوگئے تھے اور سن کر قلق اور افسوس ہی ہوا تھا... لیکن آپ نے بہت پہلے مستقبل کی سیاسی معرکہ آرائی کا جو نقشہ کھینچا تھا‘ اس کی پوری پوری تصدیق ہوگئی تھی۔“

اگرچہ پاکستان کی تاریخ کے اس عظیم ترین سیاسی ایجی ٹیشن میں جو نومبر ۱۹۶۸ء میں شروع ہو کر بالآخر مارچ ۱۹۶۹ء میں دوسرے مارشل لاء کے نفاذ پر منتج ہوا تھا ‘دائیں اور بائیں بازو کے

عناصر بہت حد تک گڈ مڈ تھے لیکن دو باتیں بالکل واضح تھیں۔ ایک یہ کہ دائیں اور بائیں بازو کے عناصر کی واضح تقسیم کا عمل (polarization) تیزی سے ہورہا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس عوامی تحریک میں بائیں بازو کے عناصر کا پلڑا فیصلہ کن طور پر بھاری تھا اور دائیں بازو کے عناصر اپنے آپ کو بالکل ایک مخمصے کی سی کیفیت میں گرفتار پا رہے

تھے اور اگر وہ تحریک جاری رہتی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہوجاتا‘جس کی ابتدا بھی کم ازکم مشرقی پاکستان میں تو مولانا بھاشانی کی سرکردگی میں ہوگئی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں میں سے کسی میں بھی یہ دم خم نہ تھا کہ وہ اس عوامی تحریک کی راہ روک سکتی۔ یہ تحریک رکی تو صرف سابق صدر ایوب کی حکمت عملی سے جس کے لیے صاحب موصوف بالکل بجا طور پر دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کے تشکر و امتنان کے حقدار ہیں! (چنانچہ گول میز کانفرنس کے دوران ان جماعتوں کے زعماء نے صدر ایوب کی جو مدح وثنا کی تھی‘اس سے یہ قرض کسی حد تک ادا بھی ہوگیا تھا‘ اور اب اگر ان کی اکثریت دوبارہ اپنی تقاریر کو ان پر تیز وتند تنقید سے مزین کرنے لگی ہے تو یہ غالباً ایک مجبوری ہے جس کے لیے وہ معذور ہیں۔ اس لیے کہ: ع ''بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!'')

سیاسی جماعتوں سے افہام و تفہیم اور گفت و شنید پر آمادگی‘ڈی اے سی کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کرنا اور پھر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (RTC) کا انعقاد! ایسے اقدامات کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اس وقت بالکل بجا طور پر ''غیر فوجی انقلاب'' (CIVILIAN COUP DETAT) سے تعبیر کیا تھا اور واقعہ یہی ہے کہ ان کے ذریعے کم ازکم مغربی پاکستان کی حد تک ''انقلاب''کی راہیں مسدود ہوگئی تھیں۔

گول میز کانفرنس کی ناکامی کا پورا الزام شیخ مجیب الرحمن کے سر تو خوا مخواہ لگ گیا‘حتیٰ کہ بعض نادان لوگوں نے اس کا حصہ رسدی میاں ممتاز دولتانہ تک بھی صرف اس لیے پہنچا دیا کہ انہوں نے شیخ صاحب موصوف کو گول میز کانفرنس میں شریک کرنے پر اصرار کرنے میں پہل کی تھی‘ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خود شیخ صاحب خالص ''سیاسی'' آدمی ہیں ''انقلابی'' ہرگز نہیں

اور خود ان کی پشت پر بھی مغرب کے ڈوبتے سورج کا سایہ ہے‘مشرق کے ابھرتے ہوئے سورج کا نہیں۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی ایسے عظیم ''انقلابی'' آدمی نے عوامی ایجی ٹیشن کی باگ ڈور سنبھال لی تھی اور شیخ صاحب خوب جانتے تھے کہ اگر وہ راولپنڈی میں کچھ لے دے کر سودا کرلیں تو پلٹن میدان تک پہنچنا تو دور کی بات ہے‘ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اترنا ہی محال ہوجائے گا۔

بہرحال متذکرہ بالا ''غیر فوجی انقلاب''مشرقی پاکستان کے لیے ناکافی ثابت ہوا اور وہاں عوامی تحریک کو روکنے کے لیے سابق صدر ایوب کو پہلے آئندہ کے لیے صدارتی الیکشن میں حصہ نہ لینے کے فیصلہ کا اعلان‘پھر اگرتلہ سازش کیس کی واپسی ایسی گراں قیمتیں ادا کرنے کے بعد بھی اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا کہ خود حکومت سے دستبردار ہوکر نظم و نسق اور امن و امان کے قیام کی ذمہ داری فوج کے حوالے کردیں۔ اس طرح انہیں بالآخر ملک کو دوبارہ فوج کے سپرد کرتے ہی بنی‘اور پاکستان دوسرے مارشل لاء کی آہنی گود میں چلا گیا۔

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد کچھ عرصہ گومگو (suspense) کی کیفیت طاری رہنا فطری تھا‘جس کے دوران عوامی ایجی ٹیشن بالکل فرو ہوگیا اور پاکستان کے مشرقی اور مغربی دونوں خطوں میں پرسکون کیفیت پیدا ہوگئی ۔ نتیجتاً دائیں بازو کے ’’سیاست دانوں‘‘کو بھی سکھ چین کا سانس لینا نصیب ہوا اور انہوں نے بھی بند کمروں‘کوٹھیوں کے باغیچوں اور آراستہ پیراستہ ہوٹلوں میں منعقد ہونے والی پریس کانفرنسوں میں چہکنا شروع کردیا۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ملکی سیاست کے میدان میں دائیں اور بائیں بازو کے کیمپوں کی واضح تشکیل کا عمل (polarization) بھی وقتی طور پر معطل ہوگیا !

ادھر نئے صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر آغا محمد یحییٰ خاں نے کل چھ سات ماہ کے عرصے میں ملک کی اس سیاسی و آئینی گاڑی کو جو پٹڑی سے اتری ہوئی ہے دوبارہ راستے پر ڈالنے کی

غرض سے پر امن انتقالِ اقتدار کے واضح اقدامات کا متعین پروگرام اور ٹائم ٹیبل سمیت اعلان کرکے اپنے سر سے پورا الزام اتار پھینکا اور ایک انگریزی محاورے کے مطابق گیند کو قطعی طور پر عوام کے پالے میں پہنچا دیا ۔ اس طرح ’’سیاست دانوں‘‘ کے لیے تو راہیں ایک دم کشادہ ہوگئیں لیکن ’’انقلابی‘‘ لوگ بالکل اسی طرح کے مخمصے میں پھنس کر رہ گئے جس طرح کے مخمصے میں عوامی ایجی ٹیشن کے دوران دائیں بازو کے سیاست دان پھنس گئے تھے۔

پاکستان کی بائیں بازو کی قوتوں کے بارے میں جنوری ۱۹۶۹ء میں ہم نے یہ رائے ظاہر کی تھی:

’’مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی اس کی ایک عظیم علامت ہیں اور مغربی پاکستان میں یوں تو اس کے کئی ایک دھڑے ہیں لیکن اس کی اصل علامت کی حیثیت بلاشبہ مسٹر بھٹو کو حاصل ہو گئی ہے۔ اگرچہ ان دونوں کے مابین اشتراکِ عمل کی کوئی واضح صورت تا حال سامنے نہیں آئی‘تاہم یہ ایک یقینی امر ہے کہ عنقریب ان دونوں میں اتحاد کی صورت پیدا ہوجائے گی اور پھر یہ بائیں بازو کا وہ اصل مرکز (نیوکلیئس) ہوگا جس کے گرد ملک کے تمام سوشلسٹ عناصر حتیٰ کہ معتدل مزاج (یا عام اخباری اصطلاح کے مطابق ماسکو نواز) طبقے بھی جو اس وقت پی ڈی ایم کے ساتھ ہیں‘جلد یا بدیر جمع ہونے پر مجبور ہوجائیں گے۔‘‘

ان میں سے مولانا بھاشانی اور ان کے گروہ نے تو تا حال الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان بھی نہیں کیا اور وہ برملا کہہ رہے ہیں کہ الیکشن کی کوئی اہمیت سرے سے ہے ہی نہیں‘اصل مسئلہ روٹی کا ہے جسے ووٹ سے قبل حل ہونا چاہیے۔ مغربی پاکستان میں مسٹر بھٹو اگرچہ الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کرچکے ہیں لیکن یہ بھی غالباً یہاں کی عام فضا کے زیر اثر ہے ورنہ ان کی اکثر تقریروں کا ٹیپ کا بند یہی ہوتا ہے کہ پاکستان اس وقت جن مسائل سے دو چار ہے ان کی نوعیت فی الاصل سیاسی نہیں ‘معاشی ہے۔بایں ہمہ چونکہ حکومت وقت کا موقف بالکل منطقی اور

اتنا صاف ہے کہ جس پر کسی براہ راست چوٹ (frontal attack) کی گنجائش نہیں لہٰذا بائیں بازو کی قوتیں اس وقت بالکل ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن ''کی سی صورتحال سے دوچار ہیں اور الیکشن کے بارے میں ان کا رویہ ع
''صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں''

کا مصداق بن کر رہ گیا ہے۔
ویسے بھی سیدھی سی بات ہے کہ ''سیاسی سرگرمی''کی نوعیت کچھ اور ہوتی ہے اور ''انقلابی

جدوجہد''کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ الیکشن کو جہاں ایک طرف سیاسی سرگرمی کے نقطۂ عروج کی حیثیت حاصل ہوتی ہے'وہاں ایک انقلابی کارکن کے نقطہ نظر سے وہ کھیل تماشے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتابلکہ اس کے نزدیک اس کی اصل حیثیت ایک گلے سڑے نظام کے عفونت بھرے سنڈاس کی ہوتی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

الیکشن' ممبری' کرسی' صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

پاکستان کے سیاسی میدان میں اس وقت دو گروہ تو ایسے ہیں جو ''انقلاب'' کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں'یعنی ایک بائیں بازو کے عناصر جو سوشلسٹ انقلاب کے علمبردار ہیں اور دوسری جماعت اسلامی جو اسلامی انقلاب کی علمبرداری کا ادعا کرتی ہے۔ باقی تمام عناصر خالص سیاسی مزاج کے حامل ہیں جن میں سے کچھ قومی سیاست کے علمبردار ہیں'ایک گروہ خالص مذہبی سیاست کا دعوے دار ہے اور بقیہ علاقائی نیشنلزم کا پرچم اٹھائے ہوئے ہیں۔

بائیں بازو کی قوتوں میں سے بھی ہمارے نزدیک خالص اور ٹھیٹھ انقلابی مزاج صرف مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی کا ہے اور اگرچہ فی الوقت انہوں نے بھی شیخ مجیب الرحمن کے بنگلہ نیشنلزم کے نعرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستانی قوم پرستی کا راگ الاپنا شروع کردیا ہے'تاہم حقیقت یہی ہے کہ وہ اول و آخر خالص سوشلسٹ انقلاب کے داعی ہیں۔ رہے مسٹر بھٹو تو وہ بائیں بازو کی جانب فیصلہ کن رجحان رکھنے کے باوجود ''انقلابی'' سے زیادہ ''سیاسی'' مزاج کے حامل ہیں۔بنا بریں اگرچہ اسلام پر تو ان کی کرم فرمائی صرف شدید ضرورت کے تحت

اور وہ بھی برائے نام ہی ہوتی ہے‘ تاہم پاکستانی قوم پرستی کا عنصر ان کی تحریک میں ایک مستقل جزو کی حیثیت سے شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا بھاشانی اور ان کی جماعت نے نہ صرف یہ کہ تاحال الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ نہیں کیا بلکہ گمان غالب یہی ہے کہ وہ الیکشن کا مقاطعہ کرکے ''تحریک'' کا راستہ اختیار کریں گے اور کسی نہ کسی راہ سے کوئی عوامی ایجی ٹیشن برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔ خود مسٹر بھٹو بھی الیکشن میں حصہ لینے کے اعلان اور اس کی بھرپور تیاری کے ساتھ ساتھ ''تحریک'' کی راہ بھی کھلی رکھے ہوئے ہیں اور ایسا آتش گیر مواد بھی جا بجا چھڑکتے چلے جا رہے ہیں جو ''بوقت ضرورت ''کام آسکے اور جس سے کسی مناسب موقع پر کسی عوامی ایجی ٹیشن کا دھماکہ پیدا کیا جا سکے۔

رہی جماعت اسلامی تو اس کے بارے میں چونکہ ہماری مستقل رائے یہ ہے کہ اس کی ابتدا تو ضرور ایک انقلابی جماعت کے انداز میں ہوئی تھی لیکن اب اس کا مزاج خالص سیاسی ہے لہٰذا اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔یہاں صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ اپنے اسی سیاسی مزاج کے ناگزیر تقاضے کے تحت جماعت اسلامی بھی نہ صرف یہ کہ الیکشن کے دنگل میں شرکت کے لیے پورے زور شور کے ساتھ لنگر لنگوٹے کس رہی ہے بلکہ اس کے نزدیک الیکشن ہی ملک و ملت کے جملہ مسائل کا واحد حل ہے۔

اصل سیاسی قوتوں میں سے‘ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا‘ کچھ قومی سیاست کی علمبردار ہیں اور نہ صرف پاکستانی قوم پرستی بلکہ کسی حد تک جذبہ ملی کا پرچم بھی اٹھائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا فطری طور پر ان کے نعروں میں اسلام اور نظریہ پاکستان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے‘ چاہے اس کے رہنماؤں کی زندگیوں میں نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ ایسے بنیادی شعائر اسلام تک کا دُور دُور تک کوئی نام و نشان نظر نہ آئے۔ یہ عناصر در اصل تحریک مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے اصل وارث ہیں اور فی الوقت پی ڈی پی اور مسلم لیگ کے ان متعدد دھڑوں پر مشتمل ہیں جن کے مابین بعض سیاسی پہلوانوں کی شخصیتوں کے تصادم کے سوا اور کوئی چیز مابہ الاختلاف موجود نہیں۔ دوسرا گروہ جو آل پاکستان سطح پر سیاست میں حصہ لے رہا ہے‘ جمعیت علمائے اسلام کا ہے جو نظریۂ پاکستان سے زیادہ اسلام کا علمبردار ہے اور جس کا اسلام کے ساتھ مخلصانہ تعلق بھی ظاہر و باہر ہے‘ لیکن فی الوقت بائیں بازو کی قوتوں کا ساتھ دینے کی وجہ سے کفر تک کے فتووں کا ہدف بن رہا ہے۔ اس گروہ کے بارے میں بھی ہم بعد میں تفصیل سے کلام کریں گے۔

باقی سیاسی جماعتیں علاقائی رجحانات کی حامل ہیں جو اپنے اپنے علاقوں کی تہذیب‘ زبان‘ کلچر‘ مالی مفادات اور سیاسی و معاشی حقوق کے تحفظ کے نعروں کے سہارے اقتدار کی جنگ جیتنا چاہتی ہیں ۔ ان میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ بااثر جماعت شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ ہے جو بنگلہ نیشنلزم اور مشرقی بنگال کے

معاشی و سیاسی حقوق کی بازیافت کی تحریک کا پرچم اٹھائے ہوئے ہے اور اس وقت بلاشک و شبہ مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی ''سیاسی'' قوت ہے ۔ دوسرے نمبر پر عبدالولی خان کی نیپ ہے جو سرحد اور بلوچستان میں علاقائی نیشنلزم کو ہوا دے رہی ہے جبکہ کراچی اور مشرقی پاکستان میں مزدوروں اور کسانوں کے مفادات کادم بھر رہی ہے۔ تیسرے نمبر پر جی ایم سید

اور ان کا سیاسی ٹولہ ہے جو سندھ میں سندھی نیشنلزم کی آگ بھڑکا رہا ہے۔ ان تمام دھڑوں کے مابین ایک قدر تو مشترک ہے' یعنی علاقہ پرستی اور ریجنل نیشنلزم لیکن ایک اہم پہلو مابہ الامتیاز بھی ہے' یعنی یہ کہ جب کہ شیخ مجیب الرحمن اور ان کی عوامی لیگ پرانے اور پختہ کار rightist ہیں' بقیہ تمام کے تمام کم از کم معتدل حد تک ضرور leftist ہیں۔

ان اختلافات کے علی الرغم جہاں تک متذکرہ بالا سیاسی گروہوں کا تعلق ہے' اس پرانے اور صدفی صد درست مقولے کے مطابق کہ ''سیاست میں کوئی چیز آخری اور حتمی نہیں ہوتی'' ان کے مابین جوڑ توڑ' کسر و انکسار اور ''ادھر سے کٹ ادھر جڑ'' کے عمل کا مستقلاً جاری رہنا بالکل طبعی اور فطری امر ہے اور اس پر خوا مخواہ ناک بھوں چڑھانے اور واویلا کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ کچھ مہلت عمر صرف اس اتحاد اور اتفاق کو مل سکتی ہے جو چاہے کتنا ہی جزوی سہی بہرحال کسی نہ کسی قدر مشترک کی بنیاد پر قائم ہو۔ مثلاً دولتانہ اور مجیب کے مابین چاہے قومی اور علاقائی سطح کا فرق موجود ہو' دائیں بازو کی قدرِ مشترک بھی موجود ہے۔ چنانچہ ان کے مابین مفاہمت اگر ہوچکی ہے تو کسی قدر پائیدار بھی ثابت ہوگی اور اگر نہیں ہوئی تو کسی بھی وقت ہو سکتی ہے' لیکن جی ایم سید سے دولتانہ کا اتحاد بالکل بے بنیاد تھا اور اسے ختم ہی ہوجانا چاہیے تھا۔ دوسری طرف سید اور مجیب کے مابین علاقہ پرستی کی قدر مشترک موجود تھی جس کی بنا پر اتحاد ہوگیا' اور یہ پائیدار بھی ثابت ہوگا۔ وقس علی ہذا۔

الغرض پاکستان کے سیاسی میدان میں اس وقت ایک جماعت خالص انقلابی ہے یعنی مولانا بھاشانی کی نیپ۔ تین جماعتیں نیم مقصدی اور نیم سیاسی ہیں یعنی جماعت اسلامی' جمعیت علماء اسلام اور پاکستان پیپلز پارٹی۔ ان میں سے مقدم الذکر دونوں مذہبی رنگ کی حامل ہیں جبکہ تیسری اس اعتبار سے بالکل بے رنگ ہے' اور موخر الذکر دونوں بائیں بازو سے تعلق رکھتی ہیں جبکہ پہلی extreme rightist ہے۔ بقیہ تمام جماعتیں خالص سیاسی ہیں چاہے پاکستانی قومیت کی علمبردار ہوں چاہے علاقائی نیشنلزم کی۔

متذکرہ بالا جماعتوں کے علاوہ کچھ اور گروپ بھی سیاسی میدان میں برسر عمل ہیں۔ مثلاً ایک ایئر مارشل اصغر خان جو اپنی ذات ہی میں ایک انجمن ہیں اور اب تک تو کٹی ہوئی پتنگ کے مانند ادھر اُدھر پھر رہے تھے لیکن اب

''تحریک استقلال'' کے اجراء کے عزم کے ساتھ از سر نو سامنے آئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ مذہبی گروپ ہیں جن کی اپنی تو کوئی خاص سیاسی اہمیت نہیں' لیکن اس اعتبار سے خاصی اہمیت ہوگئی ہے کہ ان سب کا متفقہ وزن دائیں بازو کے پلڑے میں پڑ رہا ہے۔ ہماری مراد مرکزی جمعیت علماء اسلام' مرکزی جمعیت اہل حدیث اور جمعیت علمائے پاکستان وغیرہ مذہبی گروہوں سے ہے۔ ان کے سیاسی موقف پر ہم آئندہ اظہار خیال کریں گے۔

پاکستان میں آئندہ حالات کیا رخ اختیار کریں گے ؟ اس سوال کے جواب کا کلی انحصار اس امر پر ہے کہ آیا بائیں بازو کی اصل قوتیں مستقبل قریب میں کسی انقلابی تحریک اور عوامی ایجی ٹیشن کے اجراء کا انتہائی اقدام کر گزرتی ہیں یا نہیں ! مولانا بھاشانی کے بارے میں ہم اوپر عرض کر آئے ہیں کہ اس وقت ان کی حالت اس شیر کی سی ہے جو نرغے میں آگیا ہو اور کسی راستے کی تلاش میں دیوانہ وار ادھر اُدھر دوڑ رہا ہو۔ چنانچہ وہ کبھی پاکستان کی سا لمیت کی دہائی دیتے ہیں ' کبھی ''خلافت ربانیہ'' کا نعرہ لگاتے ہیں اور کبھی ''اسلامی ثقافتی انقلاب'' کا راگ الاپتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تاحال انہیں کوئی ''مخرج'' نظر نہیں آیا۔ تاہم چند اسباب کی بنا پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جیسے تیسے کسی نہ کسی بہانے کوئی نہ کوئی انتہائی اقدام کر گزریں گے' اس لیے کہ نرغے میں آئی ہوئی تو بلی بھی شیر ہوجاتی ہے اور ایک desperate انسان سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔ پھر مولانا بھاشانی عمر کی اس حد کو بھی پہنچ چکے ہیں جہاں مزید انتظار کی گنجائش مشکل ہی سے رہ جاتی ہے۔ دوسری طرف مسٹر بھٹو کو بھی صاف نظر آرہا ہے کہ کسی عوامی ایجی ٹیشن کی صورت میں ان کے chances الیکشن کی نسبت بہرحال زیادہ ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ ہم عرض کرچکے' وہ الیکشن کی تیاری کے ساتھ ساتھ پاکستان کی خارجہ حکمت عملی میں ''شفٹ'' اور خصوصاً پاک چین دوستی' پاک و ہند جھگڑے اور قضیے اور پاکستان اور امریکہ کے تعلقات ایسے مسائل کو بھی چھیڑ رہے ہیں اور کبھی کسی مرکزی وزیر کو برسر عام للکار کر اور کبھی لائسنسوں اور پرمٹوں وغیرہ کی بندر بانٹ کا تذکرہ کر

کے پرسکون سیاسی فضا میں تلاطم کی لہریں اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مزید برآں ' ''تاشقند کا بلا'' بھی ابھی ان کے تھیلے میں محفوظ ہے۔

اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس وقت زیر ترقی ممالک کی اکثریت جن حالات سے دوچار ہے ان کے پیش نظر خصوصاً ایسے ملکوں میں جہاں سیاسی خلا بھی پایا جاتا ہو' کسی عوامی ایجی ٹیشن کا برپا کردینا کوئی مشکل کام نہیں۔

عوام کی زندگی جس طرح دن بدن اجیرن ہوتی چلی جا رہی ہے ' اس کی بنا پر عوام توع ''دیوانہ را ہوئے بس است'' کے مصداق بس اس کے منتظر ہوتے ہیں کہ کوئی ذرا ہمت اور جرأت سے کام لے کر ایک بار کوئی زور دار نعرہ لگا دے۔

جہاں تک ہمت و جرأت کا تعلق ہے ‘مسٹر بھٹو تو ماضی قریب ہی میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ان میں چاہے اور کسی چیز کی کتنی بھی کمی کیوں نہ ہو‘ہمت و جرأت کی ہرگز کوئی کمی نہیں۔رہے مولانا بھاشانی تو ان کا بھی پورا سیاسی کیریئر جرأت اور ہمت کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔

بنا بریں پاکستان کے سوشلسٹ عناصر کی جانب سے کسی انقلابی اقدام کا امکان ہرگز خارج از بحث نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ بحالات موجودہ بہت متوقع ہے۔

لیکن اگر ایسا ہوگیا تو... ایک طرف تو اس کا نتیجہ ہمارے نزدیک ایک بہت بڑے خون خرابے کی صورت میں ظاہر ہوگا جو مغربی پاکستان میں تو چاہے زیادہ ہولناک نہ ہو ‘ مشرقی پاکستان میں بالکل انڈونیشیا کے پیمانے پر ہوگا جس کے نتیجے میں پاکستان کا وجود تک سخت خطرے سے دو چار ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف ایسے کسی اقدام سے ہمارے نزدیک بحالاتِ موجودہ سوشلسٹ عناصر کی کامیابی کے امکانات بھی بہت کم ہیں‘اس لیے کہ ان کا مقابلہ بیک وقت دو طاقتوں سے ہوگا۔ ایک طرف حکومت وقت ہوگی اور وہ بھی سیاسی نہیں فوجی جو امن و امان کو برقرار رکھنے کے فرض کو ادا کرے گی اور دوسری طرف مخالف سیاسی قوتیں ہوں گی جن کو اس طرح آپ سے آپ گویا حکومت کا کور بھی حاصل ہوجائے گا... اور پاکستان کے سوشلسٹ عناصر ابھی اتنے طاقتور بہرحال نہیں ہیں کہ ایسی دو طرفہ جنگ لڑ کر بھی کامیاب ہوجائیں ۔

لہٰذا ہماری استدعا پاکستان کے سوشلسٹ عناصر سے یہی ہے کہ وہ اس آگ سے

کھیلنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سیدھی طرح سیاسی میدان میں اپوزیشن کا معروف کردار اختیار کرکے ایک مضبوط اور پیہم سیاسی عمل کے ذریعے رائے عامہ کو ہموار کریں‘اور اس طرح ملک کے سیاسی و معاشی ڈھانچے میں وہ تبدیلیاں برپا کرنے کی کوشش کریں جو انہیں مناسب اور ضروری معلوم ہوں۔

لیکن چونکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اول تو ہماری اس درخواست کا اس کیمپ کے کانوں تک پہنچنا ہی بہت مشکل ہے اور اگر یہ مرحلہ بھی کسی طرح سر ہوجائے تو اس کی قبولیت کا امکان بہت کم ہے‘لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان حضرات کو تحمل اور بردباری کے ساتھ غور و فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور پاکستان کو بد امنی‘ انتشار‘فتنہ و فساد اور خون خرابے کے اس خطرے سے بچالے جو آج عین اس کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے !

اور اگر یہ صورت پیدا ہوگئی اور پاکستان کی بائیں بازو کی قوتیں ’’آخری مقابلے‘‘ کو کسی اور موقع کے لیے مؤخر کرکے فی الوقت صرف سیاسی جدوجہد پر قناعت کرنے پر آمادہ ہوگئیں تو اگرچہ نظریاتی بحث مباحثہ (ideological debate) کی گرما گرمی تو پھر بھی باقی رہے گی لیکن ظاہر ہے کہ اصلاً سارے کا سارا کھیل خالص

سیاسی نوعیت کا رہ جائے گا اور مختلف سیاسی جماعتوں کے مابین ''کچھ دے کچھ لے'' کے اصول پر کسر و انکسار کے ذریعے معاملات طے ہوجائیں گے۔ اس صورت میں حکومت جو بھی بنے گی' بہرحال دائیں بازو کے عناصر پر مشتمل ہوگی اور بائیں بازو کو فی الحال صرف اپوزیشن کی پوزیشن پر اکتفا کرنا ہو گا۔

خالص سیاسی نقطۂ نظر سے ہمارے نزدیک اس وقت مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمن اور ان کی عوامی لیگ کو فیصلہ کن قوت حاصل ہے اور مغربی پاکستان کے دائیں بازو کے عناصر کو انہیں چاہے ناگزیر برائی (inevitable evil) کی حیثیت ہی سے سہی' بہرحال قبول کرلینا چاہیے اس لیے کہ بالآخر ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں رہ جائے گا اور ؎

ہر چہ دانا کند' کند ناداں
لیک بعد از خرابی بسیار!

کے مصداق ان کا اس وقت کا سب و شتم بعد میں نقصان دہ ہی ثابت ہو گا' مفید نہیں! اس اعتبار سے ہمارے نزدیک مسٹر دولتانہ کی سیاسی حکمت عملی بہت صحیح ہے اور وہ لوگ سخت غلطی کے مرتکب ہورہے ہیں جو حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مجیب دشمنی کے جوش میں خود مسٹر دولتانہ کو بھی مسلسل رگڑے چلے جا رہے ہیں۔

دوسری طرف مغربی پاکستان میں بھی اگرچہ دائیں بازو کی سیاسی قوت تو بہت زیادہ منتشر و منقسم ہے لیکن شخصی اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ مسٹر دولتانہ کے قد کاٹھ (stature) کا کوئی دوسرا سیاست دان ریٹائرڈ لوگوں میں ہو تو ہو کم از کم میدان میں موجود نہیں۔ اس اعتبار سے ''نظریہ پاکستان'' کی علمبردار تمام جماعتوں کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ ان کی شخصیت کو ذہنی طور پر قبول (reconcile) کرنے کا کڑوا گھونٹ جیسے تیسے بھر ہی لیں اور ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا کر ان سے مفاہمت کرلیں۔ خاص طور پر لیگ ہائے ثلاثہ کو تو اگر وہ واقعتاً اپنے مبینہ اغراض و مقاصد اور نظریات کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتی ہیں' شخصیتوں کے تصادم سے صرفِ نظر کرکے ان کی ذات پر جمع ہو ہی جانا چاہیے۔ ہماری رائے میں آنجہانی کنونشن مسلم لیگ کا وہ دھڑا جس کی قیادت بظاہر فضل القادر چودھری لیکن درحقیقت سابق صدر ایوب ہی کے ہاتھ میں ہے' غالباً جلد ہی اس ''نوشتہ دیوار'' کو پڑھ لے گا۔ رہے خان قیوم تو ان کا معاملہ خالص ذاتی نوعیت کا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ آل پاکستان سطح پر ''ابھرنے'' کی غرض سے ہر قیمت پر دولتانہ کو گرانے کی کوشش کرنے کی بجائے اپنی تمام قوتیں اور توانائیاں صرف سابق صوبہ سرحد میں علاقہ پرستی کے رجحانات کے مقابلے کے لیے وقف کردیتے لیکن ع ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!'' اسی طرح کاش کہ پی ڈی پی کے مختلف عناصر میں بھی شخصی سطح سے ابھر کر ملک و ملت کے وسیع تر مفادات کے پیش نظر حقائق کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔

رہی جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی تو ہمارے نزدیک اگر ملک کی گاڑی سیاسی پٹڑی پر چلتی رہی اور الیکشن منعقد ہونے کی نوبت آ ہی گئی تو ؎

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی ' نغمہ شادی نہ سہی

کے مصداق الیکشن کی ساری رونق انہی کے دم سے ہوگی اور سارا شور و شغب اور ہنگامہ بلکہ سر

پھٹول بھی ان ہی کے مابین ہوگا۔ واللہ اعلم !

واضح رہے کہ مندرجہ بالا تمام گفتگو خالص سیاسی نقطہ نظر سے تھی ' اور اس میں ہم نے حتی الامکان ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے واقعی صورتحال کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے جس میں ہماری پسند یا ناپسند کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے ' ہمیں اصل دلچسپی تو اگرچہ صرف دین و مذہب اور اس کے مستقبل سے ہے ' تاہم چونکہ پاکستان نہ صرف یہ کہ اسلام کے نام پر بنا ہے بلکہ ہمیں فی الواقع یہ محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کا قیام اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی خدائی تدبیر کے سلسلے کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے ' لہٰذا ہمیں دل سے اس کا بقاء و استحکام بھی مطلوب ہے۔ سیاسی جماعتوں میں سے فطری طور پر ریجنل نیشنلزم کے علمبرداروں کے مقابلے میں ہماری ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو ''نظریہ پاکستان'' کے علمبردار ہیں اور اسلام کا نام بھی لیتے ہیں ' چاہے اس کی حیثیت زبانی جمع خرچ سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ دوسری طرف جو تحریکیں معاشی بے اعتدالیوں اور ناانصافیوں کے مداوا کے طور پر ''اجتماعی معیشت'' کی علمبردار بن کر اٹھ رہی ہیں ' انہیں بھی ہم نہ دشمنِ پاکستان سمجھتے ہیں نہ دشمن اسلام بلکہ ہمارے نزدیک مناسب حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ بھی وقت کا ایک اہم تقاضا ہے اور ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ سیاسی حقوق کے ساتھ جب تک عوام کو اپنے جائز معاشی حقوق بھی حاصل نہ ہو ' جمہوریت واقعتاً ایک ''گندے انڈے'' سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ۔

ہمارے تجزیئے کے مطابق ہمارے ملک کے عوام اس وقت جاگیرداری ' سرمایہ داری اور نوکر شاہی بیک وقت تین لعنتوں کے چنگل سے نکل کر سیاسی ' معاشی اور تہذیبی استقلال سے ہمکنار ہونے کی جدوجہد کر رہے ہیں اور اس وقت ہم بحیثیت ملک و قوم اپنی زندگی کے دو بالکل مختلف ادوار کے مابین ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں ! اس قسم کے عبوری دور میں جبکہ بہت سے رجحانات بیک وقت متصادم ہوں ' ایک پیچیدہ

صورتحال کا پیدا ہوجانا بالکل طبعی و فطری ہے اور بھانت بھانت کی بولیاں، شور و شغب اور کسی قدر اونچ نیچ قطعاً غیر متوقع نہیں۔

اس پر مستزاد ہیں بین الاقوامی کھینچ تان اور مختلف عالمی قوتوں کی باہمی رسہ کشی کے اثرات جن سے پیچیدگی دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہوجاتی ہے اور حالات مزید نازک صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت یہ سارے ہی عوامل کار فرما ہیں اور ان کی پیدا کردہ پیچیدگی ہی کم نہ تھی، لیکن اس میں مزید اضافہ دین ومذہب کے نام کی دہائی کی وجہ سے خوامخواہ پیدا کرلیا گیا ہے، در آنحالیکہ اجتماعی زندگی تو بہت دور کی بات ہے، دین و مذہب کو ہماری ایک عظیم اکثریت کی نجی زندگی میں بھی کسی فیصلہ کن عامل کی حیثیت حاصل نہیں۔

اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش میں اسلام ہرگز کسی قابل لحاظ فریق کی حیثیت سے شریک نہیں ہے بلکہ اسے محض ایک سیاسی نعرے کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔

ہم نے گزشتہ سال کی ابتدائی اشاعتوں میں بھی اس صورتحال کی جانب چند اشارے کیے تھے، لیکن زیادہ تفصیل میں جانا اس لیے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ ہماری گزارشات سے حاصل تو کچھ بھی نہ ہوگا البتہ کچھ ایسے بزرگ ضرور ناراض ہوجائیں گے جن کا احترام ہم تہہ دل سے کرتے ہیں۔ لیکن اب دو اسباب کی بنا پر ہمارے لیے اس موضوع پر قلم اٹھانا ضروری ہوگیا ہے:

ایک اس سبب سے کہ ہوتے ہوتے اب اس معاملے نے بہت نازک صورت اختیار کرلی ہے اور ملک کی سیاسی فضا میں اسلام اور سوشلزم کی خیالی جنگ کا کچھ ایسا ہوائی سا سماں باندھ دیا گیا ہے کہ عوام کی اکثریت کے لیے صحیح صورتحال کا فہم نہایت مشکل ہوگیا ہے اور ان میں ایک شدید جذباتی تناؤ پیدا ہورہا ہے جو کسی بھی وقت خوں ریز تصادم کی صورت اختیار کرسکتا ہے۔ چنانچہ تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ نوبت فتویٰ بازی تک پہنچ چکی ہے اور اس کا ہدف عوام ہی نہیں بالواسطہ طور پر وہ لوگ بھی بن گئے ہیں جن کی دین داری اور تقویٰ کی قسم تک کھائی جا سکتی ہے۔

اور دوسرے اس وجہ سے کہ ہمارے بزرگوں، کرم فرماؤں، دوستوں اور عزیزوں میں سے

بھی بہت سے حضرات نے ان دنوں ہمیں اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دی ہے۔ عام ملاقاتوں اور گفتگوؤں سے قطع نظر ان دنوں پے بہ پے متعدد خطوط میں اس مسئلے کو چھیڑا گیا ہے اور مختلف مشوروں سے بھی نوازا گیا ہے۔ ہمارے لیے ان سب حضرات کے خطوط کا جواب دینا مشکل ہے اور اس کے مقابلہ میں آسان تر صورت یہی ہے کہ ایک بار ہم اس موضوع پر ''میثاق'' کے صفحات میں مفصل اظہار خیال کردیں۔

چنانچہ آئندہ اشاعت میں ہم ان شاء اللہ العزیز اس موضوع پر مفصل کلام کریں گے۔

باب ششم

تحریک پاکستان کی وراثت
اور
''مذہبی رومانویت''

باب ششم
تحریک پاکستان کی وراثت

اور

''مذہبی رومانویت''

جون' جولائی ۱۹۷۰ء

آج سے تین چار ماہ قبل ان صفحات میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش میں دین و مذہب کو جس طرح اچھالا جا رہا ہے اور اسلام کے نام کو جس طرح ایک سیاسی نعرے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اس پر بھی مفصل اظہارِ خیال کریں گے اور جتنے مذہبی گروہ اس وقت سیاسی میدان میں برسرپیکار ہیں ان کے بارے میں بھی اپنی رائے تفصیل کے ساتھ پیش کریں گے۔ گزشتہ شمارے میں یہ وعدہ بوجوہ پورا نہیں کیا جا سکا تھا۔ آج کی صحبت میں ہم اللہ کا نام لے کر اپنے اس وعدے کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وَمَا توفیقی اِلا بِاللہ

العظیم۔

ان تین چار مہینوں کے دوران' اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ پاکستانی سیاست کی فضا میں ''انقلابی'' رنگ مسلسل کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم ہوچکا ہے اور اس کی جگہ انتخابی رنگ نے لے لی ہے۔

گزشتہ شمارے میں ہم نے پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کے علمبرداروں کی جانب سے کسی انقلابی جدوجہد اور عوامی ایجی ٹیشن کے اجراء کے امکان کا تذکرہ کرنے کے بعد عرض کیا تھا کہ:

''لہٰذا ہماری استدعا پاکستان کے سوشلسٹ عناصر سے یہی ہے کہ وہ اس آگ سے کھیلنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سیدھی طرح سیاسی میدان میں اپوزیشن کا معروف کردار اختیار کرکے ایک مضبوط اور پیہم سیاسی عمل کے ذریعے رائے عامہ کو ہموار کریں' اور اس ملک کے سیاسی و معاشی ڈھانچے میں وہ تبدیلیاں برپا کرنے کی کوشش کریں جو انہیں مناسب اور ضروری معلوم ہوں۔''

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ملت اسلامیہ پاکستان پر اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے

ایک یہ بھی ہے کہ چاہے اس کے ظاہری اسباب کچھ بھی رہے ہوں اور اس کا کریڈٹ کوئی بھی لے لے' بہرحال نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کسی فوری انقلاب کے امکانات تقریبا ختم ہوچکے ہیں اور تمام سیاسی جماعتیں اور سارے سیاسی گروہ پوری دلجمعی کے ساتھ انتخابات کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے ہیں۔

مسٹر بھٹو کے بارے میں ہم نے بارہا عرض کیا ہے کہ وہ خود بھی ''انقلابی'' سے زیادہ ''سیاسی'' مزاج رکھتے ہیں اور ان کی تحریک بھی نظریاتی سے زیادہ قومی رنگ کی حامل ہے۔ لہٰذا انہیں تو خالص انتخابی رنگ اختیار کرنے میں کسی دقت کے پیش آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ چنانچہ انہیں زیادہ سے زیادہ یہ کرنا پڑا کہ اپنے ڈھیلے ڈھالے جماعتی نظم میں چند ''پریشاں روزگار' آشفتہ مغز' آشفتہ ہو'' نوجوانوں کو خارج کرکے اصل اہمیت صاحب حیثیت اور ذی وجاہت لوگوں کو دے دی اور خود بھی زیادہ گرما گرم اور اشتعال انگیز باتیں کہنی بند کردیں (اگرچہ عوام کے جذبات اور ان کی دلچسپی کے اعتبار سے جو کمی اس طرح واقع ہوسکتی تھی اس کو بعض دوسرے fire brand مقررین' جیسے ریٹائرڈ میجر جنرل اکبر خاں' کی شعلہ نوائی سے پورا کرنا پڑا)۔ حد یہ ہے کہ سابق صدر ایوب خان کے فیلڈ مارشل کے منصب کی بحالی ایسے اقدام پر بھی وہ مہر بلب رہے ع

''کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں''

ویسے بھی صوبۂ سندھ کی حد تک تو ان کی جماعت یا جمعیت پہلے ہی سے عوام سے زیادہ وڈیروں کے سہارے قائم تھی۔ اب یہ رنگ مزید پختہ ہوگیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ زمینداروں اور جاگیرداروں کی باہمی سیاست

میں مسٹر بھٹو آنے والے انتخابات میں کھوڑو اور قاضی فضل اللہ گروپ کا بھرپور مقابلہ کریں گے اور کیا عجب کہ انہیں شکست دینے میں بھی کامیاب ہوجائیں۔

البتہ مولانا بھاشانی کا معاملہ بہت مختلف تھا اور ان کے لیے یہ قلب ماہیت اتنی آسان نہ تھی۔ چنانچہ ان کی گاڑی کو پٹڑی بدلتے ہوئے بہت سے شدید جھٹکے کھانے پڑے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس تک ان کا ''انقلابی'' رنگ پوری طرح قائم تھا اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس وقت تک وہ کلیتاً اپنی جماعت کے،خصوصاً مشرقی پاکستان کے انتہا پسند عناصر کے زیر اثر تھے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ان کی آتش نوائی ان کے مغربی پاکستانی ساتھیوں کی اکثریت کو پسند نہیں آئی۔ ادھر مشرق میں

ایک قابل لحاظ عنصر انتخابات کے حق میں زور لگا رہا تھا۔ چنانچہ ان کی جماعت میں ان تین چار ماہ کے دوران بڑی رسہ کشی اور کھینچا تانی رہی' اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی اعلان کردہ ملک گیر ہڑتال کی ناکامی میں جہاں خارجی اسباب کا دخل تھا وہاں اصل فیصلہ کن دخل اسی داخلی انتشار کو حاصل تھا۔

ہڑتال کی ناکامی کے بعد اس کشمکش میں رفتہ رفتہ سیاسی عنصر کا پلڑا بھاری ہوتا گیا اور مولانا بھاشانی نے پٹڑی بدلنی شروع کردی۔ چنانچہ ایک طرف تو ایسٹ پاکستان نیپ کے انتہا پسند انقلابی عناصر جن کے سرخیل مسٹر طٰہٰ تھے' پارٹی سے کٹ گئے اور دوسری طرف مولانا بھاشانی نے جو ''انقلابی سٹیم'' انقلابی جدوجہد کی تیاریوں کے دور میں کارکنوں میں بھر دی تھی اسے چند بے ضرر سے ''گھیراؤں'' میں نکلوا کر پارٹی کے انقلابی انجن کو ٹھنڈا کردیا۔ اس ڈرامے کا ڈراپ سین اس طرح ہوا کہ مولانا خود بیمار ہوکر پارٹی کونسل کے اجلاس سے غیر حاضر ہوگئے اور کونسل نے ایک طرف انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کرکے اپنی قلب ماہیت کا اعلان کردیا اور دوسری طرف مولانا بھاشانی کو تیسری بار پارٹی پریذیڈنٹ منتخب کرکے ان کی شخصیت کو بھی مجروح ہونے سے بچا لیا۔

اس طرح اصولی اعتبار سے تو اب نیشنل عوامی پارٹی کے دونوں گروپوں کے مابین کوئی فرق نہیں رہا' ماسوائے اس کے کہ بھاشانی گروپ ''تازہ واردِ بساطِ سیاست'' ہونے کی وجہ سے ابھی قدرے زیادہ ''نظریاتی'' ہے جبکہ ولی خاں گروپ ایک عرصے سے اس دشت کی بادیہ پیمائی کر رہا ہے لہٰذا قدرے زیادہ ''سیاسی'' ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں اگر ان دونوں گروپوں کے لیڈر ذاتیات سے بلند ہوسکیں تو اب جلد ہی انہیں دوبارہ باہم مدغم ہوجانا چاہیے۔ واللہ اعلم!

بہرحال بھٹو اور بھاشانی کے سیاسی و انتخابی لائن اختیار کرلینے سے پاکستان کے سر سے کسی فوری دھماکہ خیز انقلاب کا خطرہ ٹل گیا ہے اور سارا کھیل خالص سیاسی نوعیت کا رہ گیا ہے۔ فللہ الحمد!!

ان تین چار ماہ کے دوران میں اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی پاکستان میں پورے زور شور سے اور

مشرقی پاکستان میں کسی قدر کم قوت کے ساتھ تحریک پاکستان کا گویا از سر نو احیاء ہوگیا ہے۔چنانچہ ایک طرف مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور نظریۂ ملی کا راگ خوب الاپا جا رہا ہے' دوسری

طرف نظریۂ پاکستان کی دہائی دی جا رہی ہے اور اس کے تحفظ کے لیے سرمایہ داروں کی تجوریوں کے منہ کھل گئے ہیں اور تیسری طرف اسلام' اسلام کا شور مچ رہا ہے اور بہت سے خوش گمان لوگوں کی آنکھوں میں اسلامی نظام کے نفاذ اور اسلامی حکومت کے قیام کی امیدوں کے سوکھے چمن میں یکبارگی بہار کی آمد کے خیال سے چمک پیدا ہوگئی ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ اس تازہ احیاء شدہ ''تحریک پاکستان'' کے دل صد پارہ کے کچھ ٹکڑے کسی کے قبضے میں ہیں اور کچھ کسی دوسرے کے ہاتھ ۔ چنانچہ ایک طرف تحریک پاکستان کی ''مذہبی رومانویت'' ہے جس پر کم از کم تاحال بلا شرکت غیرے پوری مضبوطی کے ساتھ جماعت اسلامی قابض ہے اور اس میں وہ کسی کو بھی شریک کرنے کو تیار نہیں۔ حتیٰ کہ اس کے اصل وارثین میں سے ایک گروہ جو علماء دیوبند کے تھانوی و عثمانی حلقوں پر مشتمل ہے 'نہ صرف پورا زور صرف کرنے بلکہ چھینا جھپٹی کرنے کے باوجود جماعت اسلامی کو اس ''قبضہ غاصبانہ'' سے بے دخل کرنے میں ناکام ہورہا ہے۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا تھانوی کی طرف سے اس سلسلے کی مزید کارروائی کے سد باب کے لیے غالباً جماعت اسلامی متحدہ اسلامی محاذ کے قیام کے لیے گفت وشنید تک سے احتراز کرے گی۔ حال ہی میں تحریک پاکستان کی مذہبیت کی وراثت کا دعویدار ایک دوسرا گروپ البتہ ایسا سامنے آیا ہے جو چاہے جماعت اسلامی کو اس ''قبضہ غاصبانہ'' سے کلی طور پر بے دخل نہ کرسکے 'بہرحال اس میں سے قابل لحاظ حصہ ضرور بٹوا لے گا۔ہمارا اشارہ بریلوی مکتب فکر کے علماء اور مشائخ کی اس کانفرنس کی جانب ہے جو حال ہی میں ''دار السلام'' ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بڑی شان و آن بان کے ساتھ منعقد ہوئی ہے اور جس میں متعدد مقررین نے جماعت اسلامی پر شدید لے دے کی ہے۔

دوسری طرف اس مذہبی رومانویت کے بالکل برعکس تحریک پاکستان کے اصل اور اساسی محرک یعنی ہندوؤں کے سیاسی 'تہذیبی اور معاشی تسلط کے خوف اور اس سے بچاؤ کے جذبے کی وراثت ہے جس پر اتفاقاً ہی سہی بہرحال کم از کم مغربی پاکستان کی حد تک کلیتاً مسٹر ذوالفقار علی بھٹو قابض ہوگئے ہیں۔ تحریک پاکستان کا یہ اصل ''باطن'' اس وقت دو صورتوں میں ظاہر ہو رہا ہے:ایک ہندوستان دشمنی اور دوسرے عوام کے معاشی حقوق کی بازیافت کی جدوجہد۔ ان میں سے مقدم الذکر کی علامت (symbol) تو مسٹر بھٹو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ہی میں بن گئے تھے

اور مؤخر الذکر کی علامت وہ اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگا کر بن گئے۔ چونکہ ایک طرف یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان کے اساسی محرکات میں اصل فیصلہ کن حیثیت معاشی عوامل ہی کو حاصل تھی اور دوسری طرف اس حقیقت کا انکار بھی شدید قسم کی ڈھٹائی کے بغیر ممکن نہیں کہ اسلامی سوشلزم کا تصور مصور پاکستان علامہ اقبال کے یہاں تو پورے زور شور کے ساتھ موجود ہے ہی 'خود خالق پاکستان مسٹر محمد علی جناح اور ان کے دست راست خان لیاقت علی خاں کے یہاں بھی بصراحت مذکور ہے (یہ تو شاید پرانی باتیں معلوم ہوں' تازہ ترین انکشاف یہ ہے کہ اس خط میں جو محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی انتخابی مہم کے دوران بی ڈی ممبروں کو بھیجا اور جسے گویا ان کے چھوٹے سے منشور کی حیثیت حاصل تھی 'محترمہ فاطمہ جناح نے ٹیپ کا بند یہی ارشاد فرمایا تھا کہ ''...تاکہ ہماری آئندہ نسلیں اپنی زندگی اسلامی سوشلزم اور ان اصول و نظریات کے مطابق گزار سکیں جن کی بنیاد پر ہماری عظیم مملکت پاکستان وجود میں آئی ہے۔'' ع

''چیست یاران طریقت بعد ازیں انکارِ ما!'')

لہٰذا چاہے یہ کسی کو برا لگے چاہے بھلا' بہرحال واقعہ یہی ہے کہ تحریک پاکستان کی اصل روح باطنی کے وارث مسٹر بھٹو ہیں (اگرچہ مغربی پاکستان میں ہندوستان دشمنی کی راہ سے خان عبدالقیوم خاں اور مشرقی پاکستان میں اس خطے کے معاشی حقوق کی بازیافت کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے شیخ مجیب الرحمن بھی تحریک پاکستان کے اس جزو کی وراثت میں کسی حد تک شریک قرار دیے جا سکتے ہیں)۔

تیسری طرف تحریک پاکستان کے اس ''جسد خاکی'' کی وراثت کا مسئلہ ہے جو نواب زادوں 'جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں سے مرکب تھا اور دین و مذہب کے باب میں زیادہ سے زیادہ لبرل اسلام کا قائل تھا۔ اگرچہ مسلم لیگ بطور ایک وحدت کے تو کبھی کی مرحومین کی فہرست میں شامل ہوچکی تاہم اس کے جسد خاکی کے اجزاء ابھی موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ ٹھنڈے پیٹوں ہرگز اس بات کو برداشت نہیں کرسکتے کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی دوسری جماعت زبردستی تحریک پاکستان کی وراثت پر تنہا قابض ہوجائے اور مسلم لیگ کی واحد جانشین بن بیٹھے 'اس لیے کہ بظاہر احوال تو تحریک پاکستان کی وراثت کے اصل مدعی وہ ہیں نہ کہ کوئی اور۔ (مسلم لیگ کے ''باقیات الصالحات'' ہونے کی حیثیت سے تحریک پاکستان کی وراثت کے دعوے داروں میں فی الوقت مدعیٔ اعظم کی حیثیت بلاشبہ مسٹر ممتاز محمد خاں دولتانہ اور ان کے ساتھیوں کو حاصل ہو گئی

ہے' اگرچہ کچھ دوسرے گروپوں کا دعویٰ بھی اس باب میں بالکل بے بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔)

قصہ مختصر یہ کہ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان میں تحریک پاکستان کے احیاء کی سی کیفیت

پیدا ہوگئی ہے لیکن چونکہ تحریک پاکستان کے حصے بخرے ہو چکے ہیں اور ع
''اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے''

کے مصداق اس کی وراثت کے مدعی بہت سے ہیں' لہٰذا چاہے ''تحفظ نظریۂ پاکستان'' کے نام پر بھیک کسی ایک جماعت ہی کو زیادہ مل جائے' انتخابات کے میدان میں تحریک پاکستان کے اس حالیہ احیاء کے ثمرات بہت سی سیاسی جماعتوں کے مابین تقسیم ہوں گے اور کوئی ایک جماعت چاہے وہ کوئی سی بھی ہو' ان سے بلا شرکت غیرے متمتع نہیں ہو سکتی۔

''مذہبی رومانویت'' کی اصطلاح ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کے لیے بالکل اجنبی ہو اور وہ اس سے ناخوش بھی ہوں' اس لیے وضاحتاً عرض ہے کہ یہ ''ایجاد بندہ'' نہیں ہے بلکہ سب سے پہلے اس اصطلاح کو مسلم ہندوستان کے زمانۂ حاضر کے سب سے بڑے مؤرخ شیخ محمد اکرام صاحب نے مسلمانانِ ہند کی ماضی قریب کی تاریخ کے اس دور کی کیفیت کی تعبیر کے لیے استعمال کیا تھا جس میں مسلمانوں کی قیادت کچھ صحافی قسم کے لیڈروں کے ہاتھ آ گئی تھی جنہوں نے ملت اسلامیہ ہند کو حقائق کا مواجہہ (face) کرنے کی بجائے تصورات و جذبات کی دنیا میں رہنا سکھایا اور گویا زمین پر قدم بہ قدم چلانے کی بجائے ہوا میں اڑایا اور فضا کی پہنائیوں کی سیر کرائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے اس کے کہ قوم میں محنت و مشقت' ایثار و قربانی اور جہد مسلسل و سعی پیہم کا مادہ پیدا ہوتا اسے اکثر و بیشتر تصورات کے حسین خوابوں کی دنیا میں کھوئے رہنے اور کبھی کبھی ہڑبڑا کر اٹھنے اور جوش و ہیجان میں کچھ نعرے لگا کر پھر خوابِ خرگوش میں مبتلا ہو جانے کی عادت پڑ گئی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا ''کامریڈ'' اس مرض کی صرف ابتدائی علامات کا مظہر تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں یہ مرض اپنی پوری شدت کو پہنچا اور وہیں سے اس کی چھوت مولانا

ابو الاعلیٰ مودودی کو لگی جنہوں نے ''ترجمان القرآن'' کے ذریعے اس طرز کی صحافیانہ قیادت کے تسلسل کو برقرار رکھا۔ یہ تو اس ''سلسلۃ الذھب'' کی صرف متصل کڑیاں ہیں۔ ان کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں اس کی اور بھی شاخیں پھوٹیں' جیسے مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا ''زمیندار''۔ وقس علی ھذا۔

اس صحافیانہ قیادت نے ایک طرف مسلمانوں کو ان کی عظمت رفتہ کی داستانیں سنا کر شاد کام کیا اور ''پدرم سلطان بود'' کے نشے میں مبتلا کر دیا اور دوسری طرف حکومت الٰہیہ کے قیام اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے بلند ترین نصب العین عطا کیے لیکن اس کے لیے کسی عملی نہج کو نہ واضح کیا نہ اس کی داغ بیل ڈالی۔ نتیجتاً پوری قوم پر

مذہبی رومانویت کی سی کیفیت طاری ہوگئی جس کا تعلق ہوش سے زیادہ جوش اور عمل سے زیادہ تصور سے تھا۔

مولانا ابو الکلام مرحوم نہایت ذہین آدمی تھے۔ انہوں نے جلد ہی محسوس کرلیا کہ یہ سب ہوائی رومان ہے، حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ نتیجتاً انہوں نے جلد ہی قیامِ حکومت الٰہیہ کے ''آسمانی'' نصب العین سے دست کش ہوکر غیر ملکی سامراج سے آزادی کے حصول کا حقیر سا ''زمینی'' نصب العین اختیار کرلیا اور بقیہ زندگی خاموشی کے ساتھ اس کی تحصیل میں کھپا دی ۔ اس موقع پر مولانا مودودی آگے بڑھے اور انہوں نے مولانا ابوالکلام کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے چھوڑے ہوئے مشن کو سنبھال لیا اور اس مذہبی رومان میں مزید رنگ آمیزی شروع کردی۔ لیکن ''بد قسمتی'' سے اسی زمانے میں مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک زور پکڑ گئی اور اس نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے مذہبی رومان کی قیادت خود سنبھال لی اور اسلامی تہذیب، اسلامی تمدن، اسلامی قانون وغیرہ اصطلاحات کا استعمال کثرت سے شروع کردیا اور اس طرح وہ ''مذہبی رومانویت'' کم از کم وقتی طور پر مسلم لیگ کے قبضے میں چلی گئی۔ تب مولانا مودودی نے یہ کہہ کر کہ اس قسم کی قومی تحریکوں سے کبھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوسکتی (۱)

اس کا تو بس _____ (۱) ''اس خام خیالی (loose thinking) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی وتاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش توپیدا ہوگئی ہے جس کا نام ''اسلامی حکومت'' ہو، لیکن خالص علمی (سائنٹیفک) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کیونکر قائم ہوتی ہے۔'' (اقتباس از ''اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے'' تحریر مولانا مودودی)

''ایک ہی مخصوص'' طریقہ ہے، مسلمانوں کی قومی تحریک سے علیحدگی اختیار کرلی اور اس ''ایک ہی مخصوص ''طریق (۲)

پر کام شروع کردیا۔

۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ نے مسلمانانِ ہند کی اس مذہبی رومانویت کو خوب استعمال (exploit) کیا اور اس کے بل پر اپنی اس حیثیت کو تسلیم کرا لیا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ یہی وہ وقت تھا جبکہ بریلوی مکتب فکر کے علماء و مشائخ کی ایک بڑی تعداد اور دیوبندی مکتب فکر کے تھانوی اور عثمانی حلقے اس رومانی غبارے میں مزید ہوا بھرنے کے لیے میدان عمل میں آگئے۔ چنانچہ اسی بنا پر ہم نے سطور بالا میں ان ہی دونوں حلقوں کو تحریک پاکستان کی مذہبی رومانویت کی وراثت کے حقیقی دعویدار قرار دیا ہے۔ لیکن رومان بہرحال رومان ہی ہوتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد جلد ہی اس حسین خواب کا بھانڈہ چوراہے میں پھوٹ گیا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ ع

''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا !''

ابھی اس غبارے کی پوری گیس نکلنے نہیں پائی تھی کہ مولانا مودودی اپنے اس ''ایک ہی مخصوص ''طریق کار کو چھوڑ چھاڑ مذہبی رومانویت کے اس غبارے میں از سر نو گیس بھرنے کے لیے میدان میں آگئے۔ اول _____ (۲) اس مخصوص طریق کار کے ابتدائی ناگزیر لوازم (pre-requisites) کا بیان

مودودی صاحب ہی کے الفاظ میں سنیے:''درحقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریہ حیات' وہ مقصد زندگی' وہ معیار اخلاق' وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہو۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں... پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں ... پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام لے کر اٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ ،مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین سیاست غرض ہر شعبہ علم و فن میں ایسے آدمی موجود ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں' جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کریں اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخداشناس ائمہ فکر کے مقابلے میں اپنی عقلی و ذہنی قیادت (intellectual leadership) کا سکہ جما دیں۔'' (ایضاً)

اول انہیں اپنی اس کوشش میں بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکنع ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' کے مصداق وہ تندہی کے ساتھ کام میں لگے رہے تاآنکہ آج نہ صرف یہ کہ پاکستان میں تحریک پاکستان کی مذہبی رومانویت کا از سر نو دور دورہ ہے بلکہ اس کی وراثت پر جماعت اسلامی اس طرح قابض ہے کہ اس کے اصل اور جائز وارثوں تک کو اپنا جائز حق وصول کرنا اور جماعت اسلامی کو اس ''قبضہ غاصبانہ'' سے بے دخل کرنا مشکل نظر آرہا ہے !

تاہم جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ''قیادت پاکستان'' کے خواب کی تعبیر ابھی کہیں آس پاس بھی نظر نہیں آتی۔ اس لیے کہ اول تو تحریک پاکستان کی مذہبی رومانویت کے جائز وارث بھی میدان عمل میں آگئے ہیں اور دوسرے اس تحریک کے بعض دوسرے اجزاء بھی تھے جن کی وراثت دوسروں کو منتقل ہوچکی ہے۔ الغرض ع

''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ !''

پاکستان کے سیاسی میدان میں اس وقت جو مذہبی گروہ یا جماعتیں برسرکار ہیں ان میں سب سے نمایاں تو جماعت اسلامی ہی ہے‘دوسرے نمبر پر جمعیت علمائے اسلام ہے جس کی قیادت مولانا درخواستی‘مفتی محمود اور مولانا ہزاروی کر رہے ہیں۔ ان کے بعد چند متفرق مذہبی گروہ ہیں جو مسلک و مزاج کے اعتبار سے چاہے کتنے ہی مختلف ہوں‘ سیاسی موقف کے اعتبار سے ملت واحدہ ہیں یعنی مرکزی جمعیت علماء اسلام‘جمعیت اہل حدیث اور بریلوی مکتب فکر کے علماء ومشائخ کے مختلف گروپ۔

ان میں سے جہاں تک مؤخر الذکر متفرق گروہوں کا تعلق ہے ‘ہمیں ان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا۔ اس لیے بھی کہ سیاست ان کا مستقل مشغلہ نہیں ہے بلکہ سیاست سے ان کی دلچسپی صرف موسمی (seasonal) قسم کی ہے۔ ان کا اصل اور مستقل شغل درس و تدریس اور اپنے اپنے ہم خیال فرقوں کی مذہبی پیشوائی ہے جس کے ذیل میں مدارس و مکاتیب کے قیام و اہتمام‘مساجد کی امامت اور اپنے اپنے مخصوص عقائد کی تبلیغ و تلقین میں یہ حضرات پوری طرح مصروف رہتے ہیں اور اس لیے بھی کہ ان کی یہ موسمی سیاست بھی تضادات اور قلابازیوں سے خالی

ہے۔ آج سے پچیس سال قبل بھی یہ حضرات قومی سیاست کا مذہبی ضمیمہ بن گئے تھے‘ اور آج پھر انہوں نے یہی رول اختیار کرلیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت قومی سیاست کی علمبردار جماعت ایک ہی تھی‘ لہٰذا یہ سب متفقہ طور پر اس کے معاون و مددگار بن گئے تھے اور اب قومی سیاست کئی دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے لہٰذا ان کا تعاون بھی منقسم ہوجائے گا۔چنانچہ ان کی اکثریت تو مرحوم مسلم لیگ کے صلبی وارثوں کے مختلف گروہوں ہی کی مدد کرے گی۔ ایک قدر قلیل شاید تحریک مسلم لیگ کی معنوی وارث یعنی جماعت اسلامی کا ساتھ دے دے۔ اسلام اور سوشلزم کی ہوائی جنگ میں چونکہ ان سب گروہوں نے متفقہ طور پر جماعت اسلامی کا ساتھ دیا تھا لہٰذا جماعت اسلامی کو توقع ہوگئی تھی کہ شاید انتخابات میں بھی وہ ان سب کی متفقہ حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے لیکن جونہی وہ ہوائی جنگ ختم ہوئی اور انتخابات کی بساط بچھنی شروع ہوئی ‘اس متحدہ اسلامی محاذ کے شرکاء کے رخ بھی تبدیل ہونے شروع ہوگئے۔ حتیٰ کہ اب اتحاد و اتفاق کے لیے کبھی کراچی اور کبھی لاہور میں مذاکرات تو منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن بات نہ کسی طور بن رہی ہے نہ بن سکے گی۔ ہمارے اندازے کے مطابق مولانا احتشام الحق تھانوی کی مرکزی جمعیت علماء اسلام بالواسطہ یا بلا واسطہ کونسل مسلم لیگ کا ساتھ دے گی اور بریلوی مکتب فکر کے علماء اور مشائخ کی اکثریت اپنے اپنے علاقوں میں لیگ ہائے ثلاثہ میں سے زیادہ تر دوسری دو مسلم لیگوں سے منسلک زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں کو مضبوط کرے گی جبکہ جمعیت اہل حدیث کی تازہ نوجوان قیادت اور جمعیت علماء پاکستان کے صرف نعیمی گروپ کی حمایت جماعت اسلامی کو حاصل ہوجائے گی ۔ واللہ اعلم !

پاکستان کے سیاسی میدان کے اصل اور مستقل مذہبی کھلاڑی در حقیقت دو ہی ہیں یعنی جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام۔ اگرچہ فی الوقت یہ دونوں بالکل مخالف کیمپوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اکثر معاملات میں ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں، تاہم ان دونوں کے مابین بعض امور مشترک بھی ہیں۔

مثلاً ایک یہ کہ قبل از تقسیم ملک و قیام پاکستان ان دونوں کی راہیں مسلمانانِ ہند کی مجموعی قومی سیاست سے جدا تھیں۔ ایک گروپ کانگریس کا حامی و حلیف تھا اور دوسرے نے اپنی

ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بالکل ہی الگ بنائی تھی (اگرچہ اس اتفاق میں بھی اختلاف کا ایک رنگ موجود تھا یعنی یہ کہ مودودی صاحب نے ابتدا میں کچھ عرصے تک کم از کم نظری اور کاغذی حد تک قومی سیاست کا ساتھ دیا تھا اور اس زمانے میں جمعیت علماء ہند کے موقف پر شدید اور نہایت تلخ تنقیدیں کی تھیں جن کی یاد فریق ثانی کے ذہن سے کسی طرح محو نہیں ہو سکتی!)

دوسرے یہ کہ قیام پاکستان کے بعد یہاں کی قومی قیادت کے مقابلے میں بھی ان دونوں کا رویہ ایک جیسا رہا اور دونوں نے ہر ممکن طریق پر قومی قیادت کو کمزور کرنے کی کوشش کی، صرف اس فرق کے ساتھ کہ جبکہ جماعت اسلامی نے بزعمِ خویش قومی قیادت کے حریف کی پوزیشن سنبھال لی تھی اور وہ اس کی جگہ لینے کے لیے مثبت طور پر جارحانہ پیش قدمی کر رہی تھی وہاں جمعیت اور اس کے ہم خیال علماء کی روش اکثر و بیشتر صرف عدم تعاون اور ترک موالات کی قسم کی passive resistance تک محدود رہی۔ تاہم نتیجہ تقریباً ایک ہی رہا اور اکثر معاملات میں یہ دونوں گروہ، چاہے برضا و رغبت چاہے بادلِ ناخواستہ، ایک دوسرے سے تعاون کرتے رہے۔ چنانچہ اینٹی قادیانی موومنٹ میں جماعت کو مجبوراً احرار اور جمعیت علماء اسلام کے پیچھے لگنا پڑا اور دوسری طرف پاکستان کے پہلے دس گیارہ سالوں کے دوران اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے مطالبے اور دوسری دہائی کے دوران سابق صدر ایوب خاں کی مخالفت میں اکثر جمعیت جماعت کا ساتھ دیتی رہی حتیٰ کہ بعض مواقع پر تو حیرت انگیز حد تک اشتراکِ عمل رہا۔ مثلاً ۱۹۶۷ء میں عید الفطر کے موقع پر اور ۱۹۶۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر فضل الرحمن کے خلاف ایجی ٹیشن میں۔

تیسرے یہ کہ دونوں ہی نے احیائے دین اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے باب میں صرف نعروں پر اکتفا کی اور اس کے لیے کسی مثبت تعمیری کام کی داغ بیل نہیں ڈالی۔ اس سلسلے میں زیادہ ذمہ داری جماعت اسلامی پر عائد ہوتی ہے اور اصل گلہ اسی سے ہے۔ اس لیے کہ جیسا کہ سطور بالا میں دیے ہوئے اقتباس سے ظاہر ہے، وہ علمی و فکری انقلاب ہی کے نام پر قومی تحریک سے علیحدہ ہوئی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی کسی حد تک صلاحیت بھی اس نے اپنے اندر قیام پاکستان سے قبل کے پانچ چھ سالوں میں پیدا کر لی تھی، لیکن افسوس کہ قیام پاکستان کے بعد اس نے

ساری صلاحیتوں اور قوتوں کو سیاسی میدان میں جھونک دیا۔ رہی جمعیت علماء تو اس غریب نے نہ کبھی اس کا دعویٰ کیا اور نہ ہی علوم و فنون جدیدہ سے بعد شدید کی بنا پر اس میں ایسے کسی کام کی صلاحیت ہی ہے۔ لہٰذا اس

سے نہ کبھی اس کی کوئی توقع تھی نہ اب کوئی گلہ ہے !

ان چند مابہ الاشتراک امور کے سوا ہر اعتبار سے پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کے یہ دونوں مذہبی پہلوان ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں اور ہوتے ہوتے ان کے عناد اور بغض نے انتہائی خطرناک صورت اختیار کرلی ہے‘حتیٰ کہ اب جس شدید نوعیت کی عداوت ان دونوں کے مابین ہے اس کی مثال نہ دوسری سیاسی جماعتوں میں مل سکتی ہے نہ مذہبی گروہوں میں۔

سیاسی امور میں ان کے مابین جو بعد المشرقین پایا جاتا ہے ‘اس کے تذکرے سے قبل اس حقیقت کی جانب اشارہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان دونوں کا مذہبی رنگ بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ کسی گزشتہ اشاعت میں ہم ضمنی طور پر حاشیے میں یہ جملہ لکھ بیٹھے تھے کہ ’’جماعت اسلامی کا مذہبی رنگ ہلکا اور سطحی ہے اور قدامت پسندی اور جدت پسندی کا ملغوبہ‘جبکہ جمعیت علماء اسلام کا مذہبی رنگ نہایت گہرا بھی ہے اور خالص قدیم اور روایتی بھی‘‘۔ اس پر بہت سے لوگوں حتیٰ کہ ہمارے بعض بزرگوں اور کرم فرماؤں نے بھی ناک بھوں چڑھائی حالانکہ یہ ایک روزِ روشن کے مانند عیاں حقیقت ہے جس کا انکار بالکل آنکھیں بند کرکے ہی کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جمعیت علماء اسلام کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو پرانے سند یافتہ اور سکہ بند علماء ہیں اور سالہا سال سے درس و افتاء کی مسندوں پر رونق افروز ہیں ! پھر کیا یہ حقیقت نہیں کہ جمعیت علماء اسلام کے کارکنوں کی ایک عظیم اکثریت درس نظامی کے فارغ شدہ علماء پر مشتمل ہے یا زیر تعلیم طلبہ پر‘جبکہ جماعت اسلامی کی اصل قوت سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے جن کی اکثریت ناظرہ قرآن مجید تو شاید پڑھ لے‘کسی ایک حدیث کے متن تک کو صحیح نہیں پڑھ سکتی ! پھر ظاہری وضع قطع اور تراش خراش کے اعتبار سے بھی ان دونوں کے مابین عظیم تفاوت ہے۔ اس سلسلے میں فوری تقابل (simultaneous contrast) کا ایک موقع حال ہی میں لاہور میں پیش آیا۔ پچھلے دنوں یہاں ایک جلوس جماعت اسلامی کے زیر اہتمام ’’اسلام پسندوں‘‘کی قوت کے مظاہرے کے لیے نکالا گیا‘ اور دوسرا جمعیت علماء اسلام نے اپنی طاقت کے مظاہرے کے لیے نکالا۔ پہلے جلوس کے قائدین میں بھی چار میں سے صرف ایک باریش تھے اور شرکاء میں بھی بمشکل پانچ فی صد داڑھی والے تھے اور ان میں سے بھی زیادہ سے زیادہ ایک

فی صد کی داڑھی فقہی معیار پر پوری اترتی تھی جبکہ دوسرے جلوس کے قائدین اور شرکاء سب کم از کم پچانوے فی صد مکمل شرعی وضع قطع کے حامل تھے۔ (ان جلوسوں کے مابین ایک اور نمایاں تفاوت جس کا براہ راست تعلق جماعت اسلامی سے نہیں ہے' یہ تھا کہ ''شوکت اسلام'' کے جلوس میں نعرۂ تکبیر پر نعرۂ رسالت حاوی تھا اور کہیں کہیں سے نعرۂ حیدری کی آواز بھی سنی جاتی تھی جبکہ جمعیت علمائے اسلام کے جلوس میں دینی نعروں میں سے نعرۂ تکبیر کے سوا کوئی اور نعرہ سننے میں نہیں آیا) باقی رہا نظریات و افکار کا معاملہ تو مولانا مودودی خود تجدد پسندوں اور قدامت پرستوں کے مابین ''بیچ کی راس'' کے آدمی ہونے کے مدعی ہیں جبکہ جمعیت علماء اسلام ہے ہی ان علماء پر مشتمل جن کو قدامت پرستی اور جمود کے طعنے دیے جاتے ہیں۔تو پھر ہم نے اپنے اس جملے میں آخر اور کون سا زہر گھول دیا تھا؟

سیاسی موقف کے اعتبار سے جماعت اور جمعیت کے مابین جو بعد المشرقین پایا جاتا ہے' تجزیئے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد تین امور پر قائم ہے۔

ایک یہ کہ عالمی سیاست کے میدان میں جمعیت علماء اسلام مغربی سامراج کی جانی دشمن ہے اور اس کی بیخ کنی کے لیے وہ کسی بھی دوسری طاقت سے تعاون کو درست سمجھتی ہے (درحقیقت یہی وہ جذبہ تھا جس کے تحت ماضی میں جمعیت علماء ہند نے انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دیا تھا)جبکہ جماعت اسلامی کی رائے میں چونکہ مغربی الحاد نے کسی نہ کسی حد تک دین و مذہب کے ڈھانچے کو بھی قائم رکھا ہے اور مغربی جمہوریت میں رائے کی آزادی بھی برقرار رہتی ہے لہٰذا کمیونسٹ بلاک کے مقابلے میں مغربی طاقتیں کم تر درجے کی برائی ہیں۔

دوسرے یہ کہ بین الاسلامی اور خصوصاً بین العرب سیاست میں جمعیت کی تائید اور ہمدردیاں ان ممالک کے ساتھ ہیں جنہوں نے بادشاہتوں کے تختے الٹ کر سوشلسٹ یا نیم سوشلسٹ نظام اختیار کرلیے ہیں اور روس کی امداد کے سہارے مشرق وسطیٰ میں امریکی سامراج کے مظہر اعظم اسرائیل کے خلاف مصروفِ پیکار ہیں' جبکہ جماعت اسلامی ان ممالک کی مؤید اور حامی ہے (اور ان کی سرپرستی سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہے) جہاں ابھی ملوکیت قائم ہے اور جو سوشلزم کی مخالفت کے پردے میں امریکہ کی حمایت کا دم بھر رہے ہیں۔

تیسرے ملکی سیاست کے میدان میں حال ہی میں دائیں اور بائیں بازو کی جو تقسیم عمل میں آئی ہے اس میں جمعیت علمائے اسلام بائیں بازو کی حامی ہے اور عوام کے معاشی حقوق کی بازیافت کی جدوجہد میں مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ لیبر پارٹی کے ساتھ اس کا باقاعدہ معاہدہ ہوچکا ہے اور بائیں بازو کی دوسری تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ اس کا اتحاد کسی بھی وقت اور کسی بھی صورت میں ممکن ہے جبکہ جماعت اسلامی نے سوشلزم کی مخالفت کو اسلام اور کفر کی جنگ کا درجہ دے کر دائیں بازو کی انتہا پسند جماعت کا رنگ اختیار کرلیا ہے۔ چنانچہ ملک کے سرمایہ

دار طبقات کو اپنی نجات صرف اسی سے وابستہ نظر آتی ہے اور ان کی تجوریوں کے منہ اس کے ''تحفظ نظریۂ پاکستان فنڈ'' کے لیے کھل گئے ہیں۔

بات تو درحقیقت بس اتنی سی ہے جو اوپر بیان ہوئی لیکن شدت مخالفت میں یہی اختلافات اس صورت میں ظاہر ہورہے ہیں کہ جماعت اسلامی اور اس کے ہم خیال حلقوں کی جانب سے جمعیت پر کانگریسی مولویوں کی پھبتی کے علاوہ سوشلزم اور کمیونزم کے لیبل ہی نہیں کفر کے فتوے تک چسپاں کیے جارہے ہیں اور جمعیت کی طرف سے جماعت اور ان کے ہم نواؤں کو امریکہ کے پٹھو' سامراج کے آلۂ کار' یہودیوں کے کارندے اور سرمایہ داروں کے ایجنٹ ایسے خطابات سے نوازا جارہا ہے۔

جمعیت علمائے اسلام کے بارے میں ہم نے آج سے پورے ڈیڑھ سال قبل جبکہ پاکستانی سیاست کے موجودہ ہنگامہ خیز دور کی ابتدا ہوئی ہی تھی' ان صفحات میں کچھ گزارشات پیش کی تھیں جن سے جمعیت کے متذکرہ بالا سیاسی موقف کے تاریخی پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی یہ کہ جمعیت علماء اسلام کا عوامی مزاج اور سامراج دشمن کردار ہرگز ''حادث'' نہیں بلکہ نہایت قدیم ہے اور اپنی پشت پر ایک طویل تاریخ اور شاندار ماضی لیے ہوئے ہے اور بعض لوگوں کا یہ گمان بالکل بے بنیاد ہے کہ اس کا موجودہ رویہ صرف جماعت اسلامی کی مخالفت کا نتیجہ یا ذاتی طور پر مولانا مودودی کی دشمنی کی پیداوار ہے۔

مئی ۱۹۶۸ء میں باغ بیرون موچی دروازہ لاہور میں ان کی جو کانفرنس منعقد ہوئی اس کے تقریباً

دو سال اور ایک ماہ بعد پھر ایک عظیم الشان ''آئین شریعت کانفرنس'' لاہور میں جون کے آخری ہفتے میں جمعیت کے زیر اہتمام منعقد ہوئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اکابر و عام کارکن دونوں نہایت سخت جان اور واقعتاً آہنی چنوں کے مانند ہیں' اس لیے کہ گزشتہ ایک سال سے ملک کے تمام مذہبی عناصر متحد ہوکر ان کی مخالفت پر کمربستہ رہے ہیں اور انہوں نے ہر ممکن طریقے سے انہیں بدنام کرنے اور عوام کو ان سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی ہے' لیکن ان کے قدم آگے ہی بڑھ رہے ہیں۔ تازہ ترین اضافہ یہ ہوا ہے کہ جس طرح جماعت اسلامی گزشتہ تقریباً دس سال سے صدر ناصر اور عالمِ عرب کی عوامی تحریکوں کی دشمنی اور ان کے خلاف شدید زہر آلود پروپیگنڈے کی قیمت عرب بادشاہوں اور امیروں کی ''سرپرستی'' کی صورت میں وصول کرتی رہی ہے اسی طرح اب جمعیت بھی عرب ممالک کے فریق مخالف کی نگاہوں میں آگئی ہے اور اسے بھی کچھ نہ کچھ ''سرپرستی'' ضرور حاصل ہوجائے گی۔

ان حضرات پر 'کانگریسی مولوی' کی پھبتی سن کر خدا جانتا ہے کہ دل خون کے آنسو رونے لگتا

ہے‘اس لیے کہ اس کی اولین زد مولانا حسین احمد مدنی ؒ ایسے اکابر ملت‘ مجاہدین حریت اور زعمائے دین پر پڑتی ہے جن کے سیاسی موقف سے چاہے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے علم و فضل‘تقویٰ و تدین‘ خلوص و بے نفسی‘ عزم و ہمت‘جاں فشانی وتن دہی‘قربانی و ایثار اور حلم و تواضع کی کوئی دوسری مثال مسلم ہند کی ماضی ٔقریب کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ مولانا مدنی ؒ کی زیارت کا شرف ہماری گناہ گار آنکھوں کو تو حاصل نہیں ہوا لیکن ان کی اس ''کرامت'' کا مشاہدہ ہم نے بچشم سر کیا ہے کہ کتنے ہی مخلص اور متدین لوگوں کی آنکھوں سے ان کا نام سنتے ہی آنسوئوں کا دریا بہہ نکلتا ہے اور حلقہ دیوبند کے مدارس کی وہ زیر تعلیم نوجوان نسل جس نے مولانا کو نہ دیکھا نہ سنا‘ان کی توہین پر مرنے مارنے پر آمادہ ہوجاتی ہے۔

ذاتی طور پر ہمارے لیے تو سب سے بڑی شہادت مولانا امین احسن اصلاحی کی ہے جن کے الفاظ میں :''مولانا مدنی صرف اپنی سیاسی رائے کے سوا ہر اعتبار سے ایک مثالی شخصیت تھے۔''

اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی ایک مرتبہ مولانا اصلاحی نے سنایا کہ:جن دنوں کانگریس اور

مسلم لیگ کی کشمکش زوروں پر تھی اور مولانا مدنی اور ان کے رفقاء تنقید و استہزاء کا ہدف بنے ہوئے تھے‘ایک روز خبر آئی کہ کچھ لیگی نوجوانوں نے مولانا کے ساتھ نہایت توہین و تذلیل کا معاملہ کیا۔ ان دنوں دار الاسلام سرنا‘پٹھان کوٹ میں عام معمول یہ تھا کہ شام کے وقت ہم سب لوگ اکٹھے سیر کے لیے نہر پر جایا کرتے تھے (گویا یہ ان دنوں کی مرکز جماعت اسلامی کی شام کی نشست تھی ! مدیر)۔ وہاں مولانا مودودی سمیت کچھ لوگوں نے اس خبر پر خوش گپی کے انداز میں تبصرے کرنے شروع کیے‘لیکن میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد مولانا مودودی نے مجھ سے بھی کچھ کہنے کی فرمائش کی تو میں نے کہا کہ میں اور تو کچھ نہیں جانتا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنی ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقینا کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے ! اس پر پوری مجلس پر خاموشی طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا مودودی نے کہا: مولانا آخر جو لوگ قوم کے احساسات وجذبات کا بالکل لحاظ نہ کریں ان کے ساتھ قوم کبھی گستاخی بھی کر گزرے تو کون سی بڑی بات ہے ! اس پر میں نے مزید تو کچھ نہ کہا لیکن اپنے اس فقرے کو دہرا دیا:''میں اور تو کچھ نہیں جانتا‘صرف یہ جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنی ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقینا کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے !''

ذاتی تقویٰ و تدین کے علاوہ‘ اب تو ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ان حضرات کے سیاسی موقف کے بارے میں بھی اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ خود مولانا احتشام الحق تھانوی نے آج سے تقریباً تین سال قبل جامعہ اشرفیہ لاہور میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کچھ ایسے الفاظ کہے تھے کہ :''اب جو حالات پیش آرہے ہیں ان کو دیکھ کر تو خیال ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کے بارے میں ان حضرات کی رائے زیادہ

درست تھی جو کہتے تھے کہ پاکستان میں فروغ اسلام کو نہیں‘فرقِ باطلہ اور الحاد و اباحیت کو حاصل ہوگا !‘‘لیکن بات یہاں تک نہ پہنچے تو بھی کم از کم اتنا تو ہونا چاہیے کہ اُس وقت کی ضدم ضدا میں جو زیادتیاں ایک دوسرے پر ہوگئی تھیں اب کم از کم ان کا اعادہ تو نہ ہو۔

ہم خود اپنا یہ ذاتی احساس بھی اس مقام پر بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بقیہ تمام معاملات اور قیل و قال ایک طرف‘کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلے کے اعتبار سے تو کبھی کبھی شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا تھا کہ ’’پاکستان کی سکیم سے

ہندوستان کے مسلمانوں کی قوت جو پہلے ہی تہائی ہے وہ تو تین حصوں میں بٹ کر مزید کم ہوجائے گی اور ہندوؤں کی طاقت بالکل یکجا اور مجتمع رہے گی‘‘ ان کا خیال کس قدر درست تھا !

اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ جب بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے کسی تازہ قتل عام کی خبر آتی ہے‘ دوسرے لاکھوں اور کروڑوں حساس مسلمانوں کی طرح راقم الحروف کے دل پر بھی چھریاں چل جاتی ہیں اور نہ صرف یہ کہ یہاں کا سکھ چین کاٹ کھانے کو دوڑنے لگتا ہے بلکہ سیدنا مسیحؑ کی تمثیل کے عین مطابق ہر کھانا ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا گوشت اور ہر مشروب ان کا خون نظر آنے لگتا ہے۔

ہمیں دوسروں سے تو کوئی گلہ نہیں لیکن حیرت ناک افسوس ہوتا ہے حلقہ دیوبند ہی کے ان اکابر پر جو نہ صرف درس و افتاء بلکہ تلقین و ارشاد کی مسندوں پر رونق افروز ہوتے ہوئے بھی ایسے کٹھور دل واقع ہوئے ہیں کہ کچھ سیاسی یا روپہلی مصلحتوں کی بنا پر اب بھی ان خادمانِ دین و ملت پر کانگریسی مولوی ایسی تحقیر آمیز پھبتی کسنے سے باز نہیں رہتے۔

رہا سوشلسٹ اور کمیونسٹ ہونے کا الزام اور اس کی آڑ میں بالواسطہ کفر کا فتویٰ تو جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے وہ تو‘ جیسا کہ ہم بعد میں تفصیل سے واضح کریں گے‘یہ سب کچھ ایک شدید مجبوری اور اضطرار کے تحت حکمت عملی کے طور پر کر رہی ہے۔رہے تھانوی و عثمانی حلقے تو ان کی جانب سے یہ معاملہ کچھ تو نا سمجھی میں ہورہا ہے اور کچھ غالباً مدنی گروپ کے اس جرمِ عظیم کے انتقام کے طور پر جو اس نے جمعیت العلماء کی قیادت سے ان حضرات کو بے دخل کرکے ’’یوسف بے کارواں‘‘بنا کر کیا تھا۔ اس لیے کہ جتنی کچھ سوشلزم کی قائل جمعیت علماء اسلام ہوسکتی ہے‘اس سے کہیں زیادہ سوشلزم جماعت اسلامی نے بھی حالات سے مجبور ہوکر اپنے منشور میں داخل کرلیا ہے اور تھانوی و عثمانی اکابر کی قیادت میں مختلف مذہبی گروہوں کے ۱۱۸ علماء نے بھی اپنے فتویٰ کے ذریعے اسے سند جواز عطا فرما دیا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ بنائے نزاع سوشلزم نہیں‘کچھ اور ہے۔

جمعیت کی طرف سے ان ساری مدافعانہ گزارشات کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ خود ان کی اپنی بعض باتوں سے نہ صرف یہ کہ ان کی موجودہ قیادت کے وقار کو دھکا لگا ہے بلکہ ان کے اکابر و اسلاف کی شہرت اور نیک نامی کو بھی نقصان پہنچا ہے۔

ان چیزوں میں سے ایک ان کی شدید بد نظمی و بے ترتیبی ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات بڑی ہی مضحکہ خیز صورتیں پیش آتی ہیں اور پوری جمعیت تمسخر و استہزاء کا ہدف بنتی ہے۔ چنانچہ ماضی میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی معاملے میں جمعیت کے ایک لیڈر کا بیان کچھ اور ہوتا ہے اور کسی دوسری مقتدر ہستی کا بالکل کچھ اور... اور بالکل وہ کیفیت ہوتی ہے کہ ع

من چہ می گویم و طنبورۂ من چہ می سراید!

اگر گستاخی شمار نہ ہو تو ہم جمعیت کے اکابر کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ اس سقم کو جلد از جلد دور کرنے کی کوشش کریں اور تنظیم و جماعت بندی کے کم از کم ناگزیر لوازم کا ضرور اپنے یہاں اہتمام کریں۔

دوسری اور اہم تر چیز جمعیت کے اکابر میں سے بعض کی معیارِ شرافت سے گری ہوئی زبان اور ہلکا طرزِ تکلم ہے جس نے حقیقت یہ ہے کہ جمعیت کو خصوصاً شہروں کی پڑھی لکھی مڈل کلاس کے حلقے میں شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ہمیں ان حضرات کے خلوص میں ہرگز کوئی شک نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے جوش، جذبے اور قوتِ کارکردگی پر رشک آتا ہے، لیکن ان کے طرزِ خطاب اور اندازِ تکلم پر گردن کو ندامت سے جھکا لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ کاش کہ یہ حضرات تقریر و خطاب کے موقع پر {وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ ؕ} کی قرآنی ہدایات کو پیش نظر رکھ سکیں اور یہ اندازہ کر سکیں کہ اس کی خلاف ورزی کر کے وہ خود اپنے مقصد اور مشن کو کس قدر نقصان پہنچانے کا سبب بن رہے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ اعوان و انصار کے انتخاب میں ان کے یہاں بھی احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی بلکہ جس وقت جو شخص مفید مطلب نظر آئے اسے سر آنکھوں پر بٹھا لیا جاتا ہے، حالانکہ اس کا ایک نہایت تلخ قسم کا تجربہ انہیں ماضی قریب میں بھی ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے جلسوں اور جلوسوں میں بعض اوقات بالکل آوارہ اور اوباش لوگ شریک ہو کر ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن سے ہر شریف انسان کو ذہنی کوفت بھی ہوتی ہے اور قلبی اذیت بھی۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے ''متحدہ

اسلامی محاذ'' کا توڑ کرنے کے لیے جو ''متحدہ دینی محاذ'' جمعیت کے زیر سرپرستی بنا، اس کے جلسے میں نہایت ناگفتہ بہ صورتیں پیش آئیں۔ اور پھر یوم جہاد کے مشترکہ جلوس میں بھی اس قسم کے عناصر نے جو طرز عمل اختیار کیا اس پر

بھی ہر شخص نے نفرین و ملامت کی اور اس میں شریک ہونے کی وجہ سے جمعیت کی شہرت کو شدید نقصان پہنچا۔ ہماری ناچیز رائے میں جمعیت کو ہرگز اس طرح کے سہارے تلاش نہیں کرنے چاہئیں اور جو کام بھی ہو بس اپنی ہی قوت کے بل پر کرنا چاہیے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ غالباً اب جمعیت کے اکابر نے کم از کم اس معاملے میں تو اپنی روش تبدیل کر بھی لی ہے۔چنانچہ حالیہ آئین شریعت کانفرنس کے موقع پر جلوس و جلسوں میں بحمداللہ ایسی کوئی صورت پیدا نہیں ہونے پائی' بلکہ جلوس تو بلاشبہ اسلامی متانت' سنجیدگی اور وقار کا ایک عظیم الشان شاہکار تھا۔

رہی جماعت اسلامی تو اس کا ماضی اگرچہ کچھ زیادہ لمبا چوڑا نہیں' اس لیے کہ اس کا شجرۂ نسب زیادہ سے زیادہ مولانا ابو الکلام مرحوم کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' سے ملتا ہے یا خیری برادران سے' اور اگرچہ مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک سے اس کی علیحدگی کے اسباب کے بارے میں بھی بہت کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہے تاہم ہمارے نزدیک اس نے جو کام ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کیا وہ درست خطوط پر بھی تھا اور نتیجہ خیز بھی ! اگر وہ انہی خطوط پر کام کرتی رہتی تو شاید آج اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب ''شد پریشاں خوابِ من'' کی سی مایوس کن صورت پیش نہ کر رہا ہوتا' لیکن افسوس کہ اس نے کچھ وقتی سی ترغیبات (temptations) سے دھوکا کھا کر' جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں' خود اپنے بیان کردہ ''ایک ہی مخصوص'' طریق کار کو تج کر کے پاکستانی سیاست کے اکھاڑے میں کود جانے کا فیصلہ کر لیا اور تحریک پاکستان کی مذہبی رومانویت کے اس غبارے میں از سر نو گیس بھرنی شروع کر دی جو قیام پاکستان کے بعد تیزی سے خالی (deflate) ہو رہا تھا۔

پھر چونکہ سیاسی میدان میں داخلے کے لیے ان کے پاس سوائے مذہب کے اور کوئی اسناد (credentials) سرے سے موجود ہی نہیں تھیں لہٰذا اس میدان کے ہر مقابلے اور حصولِ اقتدار کی جنگ کے ہر معرکے کو انہیں ایک ناگزیر ضرورت کے تحت ''اسلام اور کفر'' کی

جنگ قرار دینا پڑا۔ چنانچہ کم از کم ان کے جرائد و رسائل کے صفحات کی حد تک' پاکستان میں مسلسل ۲۳ برس سے اسلام اور کفر کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔

اوّل اوّل اس جنگ میں ''کفر'' کی جانب سے لڑنے والی اور اسلام کا راستہ روکنے والی وہ قومی قیادت تھی جس میں خواجہ ناظم الدین اور سردار عبدالرب نشتر ایسے پابند صوم و صلوٰۃ اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین ایسے اسلامی ذہن رکھنے والے لوگ بھی موجود تھے۔ جب یہ قیادت کچھ خارجی دباؤ اور کچھ داخلی انتشار کی وجہ سے میدان سے ہٹی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور گمان کیا کہ اب میدان صاف ہے۔ چنانچہ ''حکمت عملی'' سے کام لیتے ہوئے ۱۹۵۵ء کے سالانہ اجتماع کی قراردادوں کے ذریعے امریکہ کو بھی سفید جھنڈی دکھا دی گئی کہ

آپ پریشان نہ ہوں‘ہم بھی کوئی غیر نہیں آپ ہی کے نیاز مند ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس وقت کی اکھیڑ پچھاڑ اور توڑ پھوڑ میں سے بجائے اس کے کہ ان کے لیے کوئی ’’خیر کی راہ‘‘ نکلتی‘الٹا ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء اور سابق صدر ایوب خاں کا دس سالہ دور اقتدار بر آمد ہوگیا۔ چنانچہ ’’اسلام اور کفر‘‘ کی جنگ کا ایک دوسرا دور شروع ہوگیا۔ اس دور کی ابتدا میں جماعت اسلامی نے ایوب خاں کے بھاری پتھر کو راستے سے ہٹانے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔ کبھی سہروردی مرحوم سے اشتراک کیا‘کبھی محترمہ فاطمہ جناح کی قیادت قبول کی۔ الغرض ع ’’ہم نے کیا کیا نہ کیا دیدہ و دل کی خاطر‘‘ لیکن جب یہ پتھر اپنی جگہ سے ٹس سے مس ہوتا نظر نہ آیا تو تھک ہار کر اپنے قدیم ترین جریدے کے ایک اداریے کے ذریعے صلح کی پیشکش کی اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن ابھی یہ دوستی صرف گول میز کانفرنس تک ہی پہنچ پائی تھی کہ خود ایوب خاں کا دورِ اقتدار ختم ہوگیا۔

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

صرف یہی نہیں بلکہ جس چیز کو مسلسل دس سال تک سب سے بڑا شر اور ساری برائیوں کی جڑ اور اسلام کے راستے کی واحد رکاوٹ ٹھہرایا تھا‘اس کے ہٹتے ہی ایک اور بلا نمودار ہوگئی اور ع ’’شامت اعمالِ ما صورتِ بھٹو گرفت‘‘ کا نقشہ نظر آنے لگا۔ علاوہ ازیں ایک طرف معاشرے کے مظلوم و مجبور طبقے یعنی کسان‘مزدور‘کم تنخواہ پانے والے سرکاری ملازم اور محنت کش ایک طوفان بن کر اٹھتے نظر آئے اور دوسری طرف ’’یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے‘‘ گلے کو آنے لگے۔

چنانچہ اسلام اور کفر کی جنگ کا ایک نیا معرکہ شروع ہوا اور سوشلزم کو کفر کا ایک ہوائی اور فرضی مورچہ قرار دے کر اس پر گولہ باری شروع کردی گئی۔

اسلام اور سوشلزم یا بالفاظ دیگر اسلام اور کفر کی ہوائی جنگ گزشتہ ایک سال سے ہمارے ملک میں پورے زور شور سے جاری ہے اور اس میں شک نہیں کہ کچھ سرمایہ داروں کی پشت پناہی اور کچھ دوسرے دینی حلقوں کی امداد نے اس جنگ میں خالص سوشلسٹ عناصر کو پسپائی پر مجبور بھی کردیا ہے‘لیکن برا ہو جمعیت علماء اسلام کا کہ وہ اس جیت کو بھی شکست میں تبدیل کرنے پر تل گئی ہے۔چنانچہ اس نے ایک طرف مزدوروں‘کسانوں اور مظلوم ومقہور عوام کی پشت پناہی شروع کردی ہے اور دوسری طرف جماعت کی امریکہ نوازی‘سامراج دوستی اور سرمایہ داروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کا بھانڈہ چوراہے میں پھوڑنا شروع کردیا ہے۔تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے اگر جماعت اسلامی کو سب سے زیادہ غصہ جمعیت علماء اسلام ہی پر آئے اور اس کے کارکن

اس کے اکابر کا تذکرہ کرتے ہوئے آپے سے باہر ہوجائیں!

ہم واضح طور پر عرض کردینا چاہتے ہیں کہ جہاں تک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی کسی حقیقی امید اور واقعی توقع کا تعلق ہے ‘وہ تو ہمیں نہ جماعت اسلامی سے ہے نہ جمعیت علماء سے اس لیے کہ ان دونوں جماعتوں کا اصل اور حقیقی مزاج سیاسی ہے۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جو کام ناگزیر اور لابد منہ ہے یعنی ایک ذہنی و فکری انقلاب اور عوام کی اخلاقی و عملی تربیت‘ وہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں کر رہا۔

لیکن جہاں تک ان دونوں مذہبی گروہوں کی سیاسی حکمت عملی کا تعلق ہے‘ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے نزدیک جماعت اسلامی کا یہ مستقل شغل کہ وہ اپنی حصولِ اقتدار کی جنگ کے ہر معرکے کو اسلام اور کفر کی جنگ بنا کرپیش کرتی ہے‘ اسلام کے حق میں نہایت مضر اور اس ملک میں مذہب کے مستقبل کے اعتبار سے سخت خطرناک ہے۔ اس چرواہے کی مانند جو خوا مخواہ ’’شیر

آیا ‘شیر آیا‘‘ کہہ کر لوگوں کو امداد کے لیے بلا کر ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا‘ہمیں اندیشہ ہے کہ ہر وقت اور ہر موقع پر ’’اسلام خطرے میں‘‘ کے نعرے لگانے سے کہیں ایسا نہ ہو کہ جب کبھی واقعی شیر آ ہی جائے اور اسلام کو حقیقی خطرہ درپیش ہو تو عوام اسے بھی مذاق سمجھ کر بیٹھے رہ جائیں اور کسی کی غیرتِ دینی جوش میں نہ آئے۔

تحریک پاکستان کے دوران بھی ’’پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ‘‘ کے نعرے بڑے زور شور سے لگے تھے اور اس وقت بھی بہت سے سادہ لوح اور نیک دل مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی امیدوں کے چراغ روشن ہوگئے تھے۔ لیکن پھر مسلسل ۲۳ سال جس طرح ان نعروں کی مٹی پلید کی گئی ‘اس سے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے لوگوں کے دلوں پر مایوسی اور ناامیدی کے کیسے کیسے اندھیارے پھیلے۔ اب پھر اسی ’’رومانویت‘‘ کا دور دورہ ہے‘لیکن انتخابات کے نتیجے میں جو کچھ ہو گا وہ کسے معلوم نہیں۔ ظاہر ہے کہ’’ اسلام اور کفر‘‘کی اس ہوائی جنگ کی فتح کے ثمرات کی ساری فصل پرانے‘پیشہ ور اور جدی و پشتی سیاست دان کاٹیں گے اور ایک بار پھر مذہبی رومانویت کا غبارہ پھٹے گا اور لوگوں میں مایوسی و بددلی کی عام لہر پھیلے گی۔اس بار اس dis-illusionment کی پوری ذمہ داری جماعت اسلامی پر عائد ہوگی۔

دوسری طرف جمعیت علماء اسلام کی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہماری رائے میں اس کی موجودہ حکمت عملی آخر کار اسلام کے لیے مفید ثابت ہوگی ۔ اس لیے کہ اس وقت اصل صورتحال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کچھ لوگوں نے طبقاتی شعور فی الواقع پیدا کردیا ہے اور کسانوں‘مزدوروں اور دوسرے محنت کش طبقات میں یہ احساس بیدار ہوگیا ہے کہ وہ مظلوم و مجبور ہیں اور ان کا استحصال ہوتا رہا ہے۔چنانچہ وہ اپنے معاشی حقوق کی بازیافت کے لیے منظم جدوجہد کا آغاز کرچکے ہیں‘ اور ملک میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ان کو مسلسل ذہنی و

فکری غذا بھی دے رہے ہیں اور اس جدوجہد میں ان کے ساتھ تعاون بھی کر رہے ہیں۔ جب تک یہ صورت پیدا نہیں ہوئی تھی اور کسان اور مزدور ''قسمت'' پر راضی و شاکر تھے' بات مختلف تھی لیکن اب صورتحال بالکل تبدیل ہوچکی ہے اور پسے ہوئے طبقات اپنا حق وصول کرنے کے لیے عملاً اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس مرحلے پر ''سرمایہ داری'' بھی اپنے تحفظ کے لیے ہر ممکن چال چل رہی ہے اور اس کے مدافعانہ ہتھیاروں میں سے ظاہر ہے کہ اہم ترین ہتھیار ''مذہب'' کا ہے۔

لہٰذا

اگر خدا نخواستہ صورت یہ ہوتی کہ ملک کے تمام مذہبی طبقات مجتمع ہوکر سرمایہ داری کے پشت پناہ بن جاتے تو یہ ہمارے نزدیک نہایت خطرناک صورتحال ہوتی' اس لیے کہ اس صورت میں عوامی طاقتوں کا سیلاب سرمایہ داری کے ساتھ ساتھ دین و مذہب کو بھی بہا کر لے جاتا۔

لیکن جمعیت علماء اسلام کے اپنے آپ کو غرباء کی صف میں کھڑا کرلینے سے بحمد اللہ یہ خطرہ دور ہوگیا ہے۔ اب ان شاء اللہ جنگ اسلام اور کفر کی نہیں رہے گی بلکہ سیاسی گروہوں کی باہمی جنگ اقتدار ہوگی' یا ایک نظریۂ سیاست و معیشت کا دوسرے نظریۂ سیاست و معیشت سے مقابلہ ہوگا!

ہم اپنے بارے میں وضاحت سے عرض کیے دیتے ہیں کہ ہمیں اصل دلچسپی صرف اسلام اور اس کی نشاۃ ثانیہ سے ہے۔ بین الاقوامی سیاست کے اتار چڑھاؤ بھی ہمارے سامنے ہیں' بین الاسلامی اور بین العرب سیاست کے بارے میں بھی ہمارا ایک نقطۂ نظر ہے اور ملکی سیاست کے پیچ و خم سے بھی ہم بحمد اللہ بالکل ناآشنا نہیں ... لیکن ہم علیٰ وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ ان چیزوں کا فی الوقت اسلام اور اس کی نشاۃ ثانیہ اور دین اور اس کے احیاء سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا ان تمام چیزوں سے نظری دلچسپی رکھنے کے باوجود ان میں سے کسی میں کسی پہلو سے کوئی عملی حصہ لینے پر ہماری طبیعت کسی طرح مائل نہیں ہوتی۔ ہم اپنی مہلت عمر اور صلاحیتوں کی حقیر سی پونجی کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے عظیم الشان کام کے کسی ایک چھوٹے سے گوشے کی خدمت میں صرف کردینے ہی کو اصل کامیابی سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق ارزانی عطا فرمائے۔ آمین!

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

باب ہفتم

''دیکھ کعبے میں شکست ِرشتۂ تسبیح شیخ !''

باب ہفتم
''دیکھ کعبے میں شکست ِرشتۂ تسبیح شیخ !''

اگست ۱۹۷۰ء

پاکستان کی موجودہ حکومت کا یہ کارنامہ بلاشبہ نہایت قابل داد ہے کہ اس نے ڈیڑھ سال سے بھی کم مدت میں ملک کو سخت ہیجان انگیز اور ہنگامہ خیز ''انقلابی'' فضا سے نکال کر نہایت پرسکون ''سیاسی'' جدوجہد کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت پاکستان کے طول و عرض میں ''انتخابی'' سرگرمی جس زور شور کے ساتھ لیکن جس ہموار طریقے پر جاری ہے اس کے پیش نظر یہ باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ صرف سال سوا سال قبل یہاں ''گھیراؤ'' اور ''جلاؤ'' کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مظاہروں' جلوسوں اور ہڑتالوں سے شہری زندگی تقریباً معطل ہوگئی تھی اور نہ صرف باہمی تصادم اور سر پھٹول بلکہ باقاعدہ کشت و خون اور سول وار کا خطرہ درپیش تھا۔

صدر یحییٰ نے اپنی ۲۸ ؍جولائی کی نشری تقریر میں اگر اس سلسلے میں کسی کریڈٹ کا دعویٰ کیا ہے تو یہ یقیناً ان کا حق ہے۔ جس قسم کے ناگفتہ بہ اور مخدوش حالات میں انہوں نے حکومت کی ذمہ داری سنبھالی تھی ان کا بیان تحصیل حاصل ہے۔ اُلجھی ہوئی صورت حال کی یہ گتھی کسی نہایت پختہ کار' معاملہ فہم اور سلجھے ہوئے سیاست دان کے ناخن تدبیر ہی سے سلجھ سکتی تھی۔ اس لیے کہ اس قسم کے حالات میں ذرا سی بے احتیاطی نہایت مضر نتائج پیدا کرسکتی ہے اور جہاں ضرورت سے زیادہ نرمی سے لوگوں کی جرأتیں بڑھ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے وہاں ضرورت سے زیادہ سختی بھی جلتی پر تیل کا کام کرسکتی ہے۔ گویا ''سردی گرمی' نرمی سختی'' کا ایک نہایت معتدل سا امتزاج ہی ایسے مواقع پر کامیاب ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ماننا پڑتا ہے کہ صدر یحییٰ اس ''بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز'' راستے پر چلنے میں کامیاب رہے۔ ابتدا میں انہوں نے قدرے نرمی سے

کام لیا جسے، جیسا کہ خود انہوں نے فرمایا، کچھ لوگوں نے کمزوری پر محمول کیا لیکن انجامِ کار ان کی یہ پالیسی صحیح ثابت ہوئی اور اس طرح واقعتاً لوگوں کے دلوں کی بھڑاس نکل گئی۔ چنانچہ بعد میں انہوں نے تدریج کے ساتھ باگیں کھینچنی شروع کردیں تا آنکہ آج اُدھر مولانا بھاشانی کے صاحب زادے ''اندر'' ہیں اور مسیح الرحمان صاحب بھی معافی مانگ کر ہی ''باہر'' آسکے ہیں، اور ادھر مسٹر بھٹو کی شوخیاں قصۂ ماضی بن چکی ہیں اور اب وہ ہر بات ناپ تول کر کررہے ہیں۔ اور صورت یہ ہے کہ انتخابی جلسے اطمینان اور سکون کے ساتھ ہو رہے ہیں اور کہیں گڑبڑ نہیں ہوپاتی ۔بڑے بڑے جلوس نکل رہے ہیں لیکن ہنگامہ نہیں ہوتا اور بڑے بڑے جغادری قسم کے ''انقلابی'' رہنما بھی ووٹوں اور سیٹوں کے ''اہتمامِ خشک و تر'' کے شدید ''دردِ سر'' میں مبتلا کاسۂ گدائی لیے مارے مارے پھر رہے ہیں۔

ان حالات میں صدر یحییٰ کا تازہ انتباہ بروقت بھی ہے اور نہایت معنی خیز بھی۔ اس لیے کہ اب حالات جس مرحلے میں داخل ہوچکے ہیں اس میں تھوڑی سی نرمی سے بھی سارے کیے کرائے پر پانی پھر سکتا ہے ۔ اب نہ صرف یہ کہ اگر حکومت امن و سکون کے قیام اور نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لیے سختی کرے تو وہ بالکل حق بجانب ہوگی بلکہ اگر صورت اس کے برعکس ہو اور حکومت کی نرمی کی وجہ سے صورت حال دوبارہ بگڑ جائے تو خود حکومت پر یہ الزام آئے گا کہ وہ اقتدار کی منتقلی کو معرضِ التوا میں رکھنا چاہتی ہے۔

اور یہ وہ الزام ہے جس سے موجودہ حکومت کم از کم تا حال بالکل بری ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ نیتوں اور ارادوں کا جاننے والا تو اللہ ہی ہے تاہم اس وقت تک صدر یحییٰ اور ان کی حکومت کے بارے میں کسی انتہائی بدگمان مزاج انسان کے لیے بھی یہ کہنا کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ اقتدار کو عوام کے منتخب نمائندوں کی طرف منتقل کرنے کے معاملے میں نیک نیت نہیں ہیں۔ انہوں نے اس معاملے میں جس پختہ عزم کے ساتھ مسلسل اور بروقت اقدامات کیے ہیں اس سے تاحال ان کی پوزیشن شک و شبہ سے بالکل بالا رہی ہے۔ اب اسی پوزیشن کا تقاضا ہے کہ ایک طرف تو وہ انتخابات کے لیے سازگار فضا برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں اور اس معاملے میں کسی نرمی کو ہرگز راہ نہ دیں بلکہ اگر ضرورت ہو تو انتخابات کے بالکل قریب ملک پر نیم فوجی و نیم سول حکومت کی بجائے خالص فوجی نظم قائم کردیں (اس سلسلے میں ہمارے نزیک یہ مطالبہ بھی بالکل صحیح ہے کہ

انتخابات سے دو ماہ قبل کم از کم صدارتی کابینہ کو توسبکدوش کر ہی دیا جائے)... اور دوسری طرف انتخابات کے التوا کے کسی مطالبے پر کان نہ دھریں بلکہ ووٹروں کو ہر امکانی سہولت مہیا کرنے پر خواہ کتنا ہی خرچ آجائے، انتخابات مقررہ تاریخ پر ضرور منعقد کرائیں تاکہ اس شبہ کی گنجائش پیدا نہ ہو سکے کہ موجودہ حکومت خود زیادہ دیر تک برسر اقتدار رہنا چاہتی ہے!

اس مؤخر الذکر معاملے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم ایک غریب قوم ہیں اور انتخابی بخار کی جس کیفیت میں ہم اس

وقت من حیث القوم مبتلا ہیں اس کو طول دینے کی ''عیاشی'' کے ہم کسی طرح متحمل نہیں ہوسکتے۔ اس وقت نہ صرف یہ کہ پوری قوم کی توجہ انتخابات پر مرتکز ہوگئی ہے بلکہ ایک غریب قوم کے روپے پیسے کی حقیر پونجی اور صلاحیتوں‘قوتوں اور اوقات کے سرمائے کا بڑا حصہ اس مد میں صرف ہورہا ہے۔ چنانچہ اب یہ مرحلہ جس قدر جلد طے ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے اور اس کو طول دینا کسی طرح صحیح نہیں۔ اس لیے کہ

ع

''اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔''

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ ''اقتدار کی منتقلی''کی ذمہ داری کا بوجھ جتنا جتنا موجودہ حکومت کے کندھوں سے اترتا جا رہا ہے اتنا ہی سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے کندھوں پر پڑتا چلا جا رہا ہے۔ جس قدر وہ بری الذمہ ہوتی جا رہی ہے اسی قدر یہ ''ذمہ دار'' بنتے چلے جا رہے ہیں... تاآنکہ اگر انتخابات بروقت منعقد ہوگئے‘ بظاہر احوال اب یہ یقینی ہی سا نظر آتا ہے‘اور پھر بھی اس ملک کے پیچیدہ مسائل حل نہ ہوئے اور معاملات کی گتھی نہ سلجھی تو مستقبل کا مورخ مجبور ہوگا کہ اس کی ذمہ داری سے موجودہ فوجی حکومت کو بالکل بری قرار دے اور سارا الزام سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں پر عائد کرے۔ گویا آئندہ چند ماہ ہمارے سیاسی رہنماؤں کے فہم وفراست‘تدبر و حکمت‘قربانی و ایثار اور سب سے بڑھ کر حب وطن اور حب قوم کے لیے کھلا چیلنج بن کر آرہے ہیں اور بزبانِ حال مبارزت خواہ ہیں کہ: ع

''پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!''

پاکستانی سیاست کا جو دور اواخر ۱۹۶۸ء سے شروع ہوا تھا اس میں اول اول انقلابیت کا دور دورہ رہا اور اس کی ایسی طوفانی آندھی آئی کہ باقی ہر چیز نگاہ سے اوجھل ہوگئی۔ اس کا زور کم ہوا اور فضا قدرے صاف ہوئی تو اسلام اور سوشلزم کی کاغذی اور ہوائی جنگ شروع ہوگئی اور کچھ عرصے کے لیے تو ایسا سماں بندھا کہ گویا ایک طرف ''نظریہ پاکستان'' ہے جو خالص اور بے میل اسلام ہے اور دوسری طرف سوشلزم ہے جو بے شک و بلا ریب کفر ہے... اور جنگ بس صرف ان دو کے مابین ہے‘بیچ کی راہ سرے سے کوئی ہے ہی نہیں! ادھر کچھ عرصے سے یہ مصنوعی شورا شوری بھی ختم ہوچکی ہے۔ چنانچہ ہوائی باتوں کے بجائے ٹھوس معاملات پر گفتگو ہونے لگی ہے اور ''رومانویت''پر حقیقت پسندی غالب آنے لگی ہے۔ نتیجتاً ایک طرف دولتانہ اور فضل القادر گلے مل گئے ہیں جبکہ

بھٹو اور قاضی فضل اللہ میں بھی ''معاملے''کی بات چیت ہوئی ہے'چاہے بیل منڈھے نہ چڑھ سکی ہو... اور دوسری طرف ''انتہا پسندی''کی مذمت ہونے لگی ہے اور باقاعدہ پرچار شروع ہوگیا ہے کہ ملک و ملت کی نجات ''بیچ کی راہ''اختیار کرنے میں ہے۔

اس سلسلے میں بعض نہایت ''عریاں حقائق''بھی بہت دلچسپ انداز میں پیش کیے جانے لگے ہیں'مثلاً یہ کہ:

''پاکستان''غیر صالح''لوگوں ہی نے قائم کیا تھا اور وہی اسے قائم رکھ سکتے ہیں!''

یا یہ کہ:

''تحریک پاکستان صرف ''لبرل اسلام''کی علمبردار تھی نہ کہ رجعت پسند مولویانہ اسلام کی!''وغیرہ وغیرہ۔

ان باتوں پر اس اعتبار سے تو اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ ''عریاں نگاری'' ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ''حقیقت نگاری''نہیں۔ سچ ہے: ؎

نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں
فقیہِ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا

ادھر ہمارے ''فقہائے مصلحت بیں''اور ''حکمائے حکمت عملی''کا حال یہ ہے کہ نہ صرف یہ

کہ اپنے پورے ماضی سے دستبردار اور سابقہ ہر موقف سے منحرف ہوگئے ہیں بلکہ اپنی ساری ذہانت اس پر صرف کر رہے ہیں کہ حقائق کو توڑ مروڑ کر اور تاریخ کو مسخ کرکے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کردکھایا جائے۔

چنانچہ ''جماعت اسلامی نے کبھی تحریک پاکستان کی مخالفت نہیں کی''! ایسے دروغِ مصلحت آمیز کا سلسلہ تو عرصہ دراز سے چل ہی رہا تھا'اب ایک قدم آگے بڑھا کر قیام پاکستان کے کریڈٹ میں بھی حصہ داری کا دعویٰ شروع ہوگیا ہے اور اس سلسلے میں جماعت کی سول سروس کے اساتین ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک نسبتاً سادہ لوح بزرگ تو کچھ عرصہ قبل ایک جلسہ عام میں یہ تک کہہ بیٹھے کہ:

''پاکستان کے قیام میں اکیلے مولانا مودودی کا حصہ باقی تمام لوگوں کے مجموعی حصے سے بھی زیادہ ہے۔''

جس پر پرائے تو خیر پرائے ہی ہوتے ہیں اپنوں (جیسے ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور) کو بھی چیخ اٹھنا پڑا کہ: ؎

اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ!

ہمارا اسی وقت یہ خیال تھا کہ یہ بات ان کی ''طبع زاد''نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ حال ہی میں بات واضح ہو گئی اور مولانا مودودی نے بہ نفس نفیس ایک طرف یہ ارشاد فرما کر کہ : ''جماعت اسلامی ہندوستان کی مسلمان قوم کے دفاع کے حصارِ ثانوی کے طور پر قائم کی گئی تھی'' قطع نظر اس سے کہ یہ صحیح ہے یا غلط'کم از کم اپنی طرف سے تو اپنی ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش (حصہ سوم)اور ''مسئلہ قومیت''ایسی تالیفات سے اعلان براء ت کردیا... اور دوسری طرف یہ اعلان کرکے کہ ''ہم نہ مردوں کو داڑھی رکھنے پر مجبور کریں گے نہ عورتوں کو برقع پہننے پر'' نہ صرف یہ کہ اپنی مایہ افتخار تصنیف ''پردہ'' سے رجوع کرلیا بلکہ اپنی مبینہ ''راسخ العقیدگی'' سے تائب ہوکر ''لبرل اسلام'' کی بارگاہ میں سجدہ سہو بھی ادا کردیا ؎

دیکھ کعبے میں شکست رشتۂ تسبیحِ شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ !

رہا یہ سوال کہ آیا اس تمام ہیر پھیر سے کچھ حاصل بھی ہوسکے گا یا نہیں؟ تو ظاہر ہے کہ جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے وہ تو بہرحال اتنی بڑی بڑی قیمتیں کسی بڑی توقع ہی پر ادا کر رہی ہے' اور یقینا کوئی بڑی ہی امید ہے(۱)

جس کی بنا پر اپنے پورے دین و مذہب کو ''اک قصہ ماضی''بنایا جا رہا ہے... لیکن ہمیں یقین ہے کہ قوم کے بارے میں یہ گمان کہ شاید یہ بھی ع ''ہنس کے وہ بولی کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو''(۲)

والا معاملہ کرلے گی'نری خوش فہمی ہے۔یہ دنیا بڑی ''حقیقت پسند''واقع ہوئی ہے اور ایسی سطحی باتوں سے یہاں کوئی دھوکا نہیں کھاتا' خصوصاً جو خود اپنے ''ماضی''ہی سے رشتہ توڑ لیں ان سے کون اپنا ''حال''وابستہ کرنا پسند کرتا ہے۔ ان کا انجام تو یہی ہوتا ہے کہ'جیسا کہ کبھی ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا'یہ بے لنگر کی کشتیوں کے مانند لہروں کے رحم و کرم پر ادھر اُدھر بھٹکتے رہیں اور ؎

ہم تو فانی جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

لی جیتی جاگتی تصویر... اور خلق خدا کے لیے عبرت کا سامان بن جائیں !

*** _____ (۱) اس فریب خوردگی پر بھی ''اسلام پسند'' حلقے کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ہفت روزہ جریدے ''زندگی'' نے اپنی ایک حالیہ اشاعت میں تحریر کیا ہے کہ: ''... لیکن گزشتہ کچھ عرصے سے انتخابی مہم کے دوران جماعت کے مختلف اکابرین نے جس طرح کے مبالغہ آمیز دعوے شروع کیے ہیں ان سے ہر صاحب نظر کو صدمہ پہنچا ہے۔ اس کے رہنماؤں کی طرف سے کبھی تو عوام کو مژدہ سنایا جاتا ہے کہ بلوچستان میں ہماری حکومت قائم ہو جائے گی اور کبھی یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ فلاں علاقے پر ہم قبضہ کر لیں گے۔ ہمیں حیرت ہے کہ ایک ایسی سیاسی جماعت جس کی بنیادی حیثیت دینی ہو' اسق کے ذمہ دار ارکان اس قدر غیر ذمہ دارانہ اندازے لگا کر خود کو خوش فہمیوں میں مبتلا کر کے اور عوام کو اپنی کامیابیوں کی لوریاں سنا کر آخر کون سی شے حاصل کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں...''

(۲) میرے اسلام کو اک قصہ مارضی سمجھو!
ہنس کے وہ بولی کہ ''پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!'' (اکبرؔ)

باب ہشتم

پاکستان کی مذہبی سیاست کا نیا ہدف

''برسر اقتدار طبقہ'' کی بجائے

''سوشلزم''

اکتوبر ۱۹۷۰ء

پاکستان کے سیاسی حالات نے اواخر ۱۹۶۸ء سے جو پلٹا کھانا شروع کیا تھا اس کی تیزی اور تندی کو تو اگرچہ سابق صدر ایوب اور حالیہ صدر یحییٰ کی حکمت عملی نے بہت حد تک روک دیا' تاہم وہ تبدیلی اندر ہی اندر دھیمی چال اور مدھم آواز کے ساتھ مسلسل جاری ہے اور اس کے اثرات صرف سیاسی میدان ہی تک محدود نہیں بلکہ ہماری اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ اس سے تدریجاً متاثر ہو رہا ہے' حتیٰ کہ صرف دو پونے دو سال میں حالات اس قدر بدل

چکے ہیں کہ پہلی بہت سی باتیں بالکل بھولی بسری یادیں معلوم ہوتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان دو سالوں میں ہم کم ازکم بیس سال کی مسافت قطع کر آئے ہیں۔

دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر' صرف ''مذہبی سیاست'' کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اواخر ۱۹۶۸ء سے ماقبل اور مابعد کے حالات میں زمین آسمان کا فرق واقع ہوچکا ہے اور اس کے مقدمات و مبادی اور صغریٰ کبریٰ سمیت ساری منطق تبدیل ہوگئی ہے۔

پاکستان کے پہلے اکیس سالوں کے دوران میں ہماری مذہبی سیاست میں کامل اتحاد اور اتفاق کا سماں بندھا رہا اور مولانا مودودی 'مولانا تھانوی یہاں تک کہ مفتی محمود اور مولانا ہزاروی (غور فرمائیے کہ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ کس قدر عجیب نظر آتا ہے کہ کبھی کسی مرحلے پر مولانا مودودی اور مولانا ہزاروی بھی ایک ہی کشتی میں سوار رہے ہیں اور دونوں کی حکمت عملی ایک ہی رہی ہے!) ایک ہی راگ الاپتے اور ایک ہی منطق کے چپوؤں سے مذہبی سیاست کی ناؤ کھیتے رہے۔

اس منطق کا صغریٰ کبریٰ یہ تھا کہ:(i)پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے ' (ii) پاکستان کے عوام کی ایک عظیم اکثریت(نو سو ننانوے فی ہزار کی حد تک)اسلام ہی کی فدائی اور شیدائی ہے اور اسلامی قانون و دستور ہی کا نفاذ چاہتی ہے' (iii)صرف ایک ''برسر اقتدار طبقہ'' ہے جو قوم کے اس ارادے کی راہ میں مزاحم ہے اور ملک کو دستوری اعتبار سے لادینیت اور تہذیبی و اخلاقی اعتبار سے بے حیائی اور اباحیت پرستی کی راہ پر چلانا چاہتا ہے' (iv)لہٰذا ساری اجتماعی جدوجہد کا رخ ان ''اربابِ اقتدار'' اور اس ''برسر اقتدار طبقے'' کے خلاف ہونا چاہیے۔ نہ تو قوم کو ان سے بدظن کرنے کی کوشش میں کوئی کمی رہنے دینی چاہیے اور نہ ہی ان کے خلاف بے چینی اور بے اطمینانی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے سے چوکنا چاہیے۔

چنانچہ ان پورے اکیس سالوں کے دوران ہماری تمام مذہبی قوتیں'چاہے وہ جماعتیں تھیں یا جمعیتیں'ایک ہی ہدف پر حملے کرتی رہیں اور تحریر و تقریر کا سارا گولہ بارود ایک ہی نشانے پر صرف ہوتا رہا۔یہ دوسری بات تھی کہ قلعہ تھا خالص ہوائی' اس لیے کہ نہ تو کبھی ''اربابِ اقتدار'' اور ''برسر اقتدار طبقہ'' کی واضح تعریف کی جا سکی اور نہ ہی اس کا حدود اربعہ متعین کیا جا سکا۔

عوام کے بارے میں چونکہ متذکرہ بالا صغریٰ کبریٰ کی رو سے یہ بات طے شدہ تھی کہ وہ تو اسلام کے فدائی اور شیدائی ہیں ہی لہٰذا ان کے ذہن و فکر کی تطہیر اور ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کا سوال منطقی طور پر خارج از بحث رہا' اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہوگئی کہ ان کی طرف سے خطاب کا رخ بالکل پھر گیا۔ گویا ان سے تو کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں'کہنا تو جو بھی کچھ تھا وہ ان کے انگوٹھوں'دستخطوں اور قراردادوں کے بل پر ''ارباب اقتدار'' سے تھا!

اس سیاست کا عظیم ترین شاہکار ۱۹۵۳ء کی اینٹی قادیانی موومنٹ تھی جو شروع تو اگرچہ مجلس احرار اسلام اور جمعیت علمائے ہند کے باقیات الصالحات نے کی تھی لیکن جس میں بعد میں اضطراراً جماعت اسلامی کو بھی اپنے پورے لاؤ لشکر سمیت شریک ہونا پڑا۔ اس موومنٹ کا نقد نتیجہ (net result) یہ نکلا کہ ''ارباب اقتدار'' کے طبقے سے نسبتاً مخلص اور دین دار عناصر کو دیس نکالا مل گیا اور ملکی سیاست کی باگ ڈور زیادہ شاطر اور عیار لوگوں کے ہاتھ میں آگئی' اور پھر وہ افراتفری مچی جس کے نتیجے میں بالآخر فوجی حکومت قائم ہوکر رہی۔

دورِ ایوبی کے اواخر میں مذہبی سیاست نے پھر طاقت پکڑنی شروع کی اور اس بار اس نے دو

کامیاب چھاپے مارے۔ ایک اوائل ۱۹۶۷ء میں عید الفطر کے موقع پر اور دوسرے اواخر ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر فضل الرحمان کے خلاف ایجی ٹیشن برپا کرکے۔ ان دونوں مواقع پر بھی ملک کے تمام مذہبی عناصر بالکل متحد تھے اور بالکل ایسا سماں بندھ گیا تھا کہ ایک طرف حکومت اور برسر اقتدار طبقہ ہے جبکہ دوسری طرف تمام علماء اور ''رجالِ دین۔'' گویا یہ پاکستان کی مذہبی سیاست کی متذکرہ بالا منطق کا نقطۂ عروج تھا۔

لیکن افسوس کہ مذہبی سیاست کے اس عروج کو ع

''خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود''

کے مصداق نہایت مختصر عمر ملی اور اواخر ۱۹۶۸ء سے ملکی سیاست ایک بالکل ہی نیا موڑ مڑ گئی۔

اس نئے موڑ کے یوں تو متعدد پہلو ہیں لیکن مذہبی سیاست جس پہلو سے سب سے زیادہ متاثر ہوئی وہ یہ ہے کہ چونکہ ایک طرف سیاسی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور دوسری طرف موجودہ فوجی حکومت نے کسی مستقل حکومت کی شکل اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی اور کم از کم تاحال اس نے ایک خالص عبوری اور care taker قسم کی حکومت کی صورت اختیار کر رکھی ہے' لہٰذا ''ارباب اقتدار'' اور ''برسر اقتدار طبقہ'' ایسی اصطلاحات بے معنی ہوکر رہ گئیں اور اس طرح گویا وہ ''ہوائی قلعہ'' فضا میں تحلیل ہوکر نگاہوں سے اوجھل ہوگیا جس پر تمام مذہبی جماعتیں متحد اور متفق ہوکر حملے کیا کرتی تھیں۔

نتیجتاً ایک جانب وہ اتحاد و اتفاق پارہ پارہ ہوگیا جس کی بنیاد حب ِعلیؓ کی مثبت اساس کے بجائے بغض معاویہؓ کی منفی بنیاد پر قائم تھی۔ چنانچہ دو سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور مذہبی جماعتیں یعنی جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوگئیں۔ دوسری طرف تصادم کا میدان بدل گیا' اور مقابلہ ''رجالِ دین'' اور ''ارباب اقتدار'' کے مابین نہ رہا بلکہ اس نے عوامی سطح پر مختلف جماعتوں اور گروہوں کے مابین تصادم کی صورت اختیار کرلی' جس میں اصل جتھہ بندی دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کے تحت ہو رہی

ہے اور اصل وزن انہی دو پلڑوں میں ہے جبکہ مذہبی جماعتیں پاسنگ کی حیثیت سے ان دونوں اطراف میں بلا واسطہ یا بالواسطہ وزن ڈالنے پر مجبور ہورہی ہیں !

133

خالص نظریاتی اعتبار سے تو پاکستانی سیاست کے موجودہ عبوری دور کو جلد ہی ختم ہوجانا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ آئندہ سال کے وسط تک انتخابات اور دستور سازی وغیرہ کے تمام مراحل طے ہوکر عوام کی نمائندہ حکومت کو قائم ہوجانا چاہیے لیکن عملاً جو کچھ نظر آرہا ہے وہ یہ ہے کہ متذکرہ بالا مراحل میں سے ہر مرحلہ نہایت کٹھن ہے اور دستور سازی کی گھاٹی تو تقریباً ناقابل عبور ہی ہے۔ بنا بریں موجودہ عبوری دور مستقل نہیں تو کم از کم ''عارضی مستقل'' ضرور ہے اور چاہے کسی کو پسند ہو یا ناپسند ‘جو کچھ نظر آرہا ہے وہ یہ ہے کہ ایک خاصی طویل مدت تک پاکستان میں عوامی کش مکش ہی کا سلسلہ چلتا رہے گا اور ''چار و ناچار'' فوج ہی کو پاکستان کی سول ایڈمنسٹریشن کی نگرانی بھی کرنی ہوگی۔ گویا ''برسر اقتدار طبقہ'' کا تصور اب ایک طویل عرصے تک مفقود رہے گا اور مذہبی جماعتوں کے اتحاد و اتفاق کی یہ منفی اساس دوبارہ وجود میں نہ آسکے گی !

تاہم کارکنوں کے لہو کو گرم رکھنا ایک ناگزیر جماعتی ضرورت ہے اور اس کے لیے ایک ایسا ہدف بھی لازم ہے جس پر کارکن مسلسل جھپٹ کر پلٹتے اور پلٹ کر جھپٹتے رہیں۔ چنانچہ اب کی بار ایک جمعیت علمائے اسلام کو چھوڑ کر بقیہ تمام مذہبی جماعتوں نے اپنی مسلسل چاند ماری کے لیے ''سوشلزم'' کا ہدف منتخب کیا ہے اور تمام مذہبی جماعتوں کے شعلہ بیان مقررین اپنا پورا زورِ خطابت اسی ایک محاذ پر صرف کر رہے ہیں اور اگرچہ مختلف مذہبی جماعتوں کی مختلف سیاسی جماعتوں سے علانیہ یا درپردہ ساز باز کی بنا پر یہ آپس میں ہرگز متحد نہیں بلکہ اندر ہی اندر ایک دوسرے کی کاٹ میں مصروف ہیں‘ تاہم کم از کم ظاہری اعتبار سے ان سب کا مشترک ہدف ''سوشلزم'' ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ ''برسر اقتدار طبقہ'' کی طرح یہ تازہ ہدف بھی ہے خالص ہوائی‘ اس لیے کہ ذرا تجزیہ کرکے دیکھا جائے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ملک میں سوشلزم کے علمبردار ہیں کون لوگ ! جماعت اسلامی اور پی ڈی پی تو ہوئیں اصلی اور ٹھیٹھ اسلام پسند‘ تینوں لیگیں بھی اور چاہے جو کچھ بھی ہوں سوشلسٹ بہرحال نہیں‘ رہے مسٹر بھٹو تو خود وہ اگرچہ ''اسلامی سوشلزم'' کا راگ الاپتے ہیں لیکن ان کے تمام سیاسی مخالفین سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ ہرگز نہیں ہیں بلکہ یا تو سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں یا صرف ایک فاشسٹ نیشنلسٹ

134

لے دے کے دو نیپیں (NAPS) رہ جاتی ہیں‘ جنہیں سوشلسٹ کہا جاسکتا ہے۔ تو اول تو ان کا حلقہ اثر ہے ہی کتنا کہ اس قدر شور و ہنگامہ اٹھانے کی ضرورت پڑ گئی‘ پھر ان میں سے بھی ولی خاں گروپ بنیادی طور پر نیشنلسٹ ہے نہ کہ

سوشلسٹ۔

ہاں ایک حقیقت ایسی ہے جسے مانے بغیر چارہ نہیں اور وہ یہ کہ اس ملک کے پڑھے لکھے طبقے' اور خاص طور پر ان میں سے بھی ذہین تر عنصر میں سوشلسٹ خیالات قابل لحاظ حد تک موجود ہیں اور نوجوان نسل کا خاصا قابل لحاظ حصہ ذہنی اور فکری طور پر اس رو میں بہہ گیا ہے۔ ان دونوں طبقات میں ایک اچھی بھلی تعداد ایسے مخلص انقلابی کارکنوں کی بھی موجود ہے جو اپنے پیش نظر انقلاب کے لیے کبھی ایک اور کبھی دوسرے سیاسی گروہ میں شامل ہو کر کام کرتے رہتے ہیں اور ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے یہ لوگ اس ملک میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تاہم اپنے جوش اور جذبہ کار اور مخصوص انقلابی تکنیک کے اعتبار سے یقینا قابل لحاظ ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں بھی دو باتیں سوچنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ لوگ آخر آئے کہاں سے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہ روس سے درآمد ہوئے ہیں نہ چین سے بلکہ اسی سرزمین کی پیداوار اور اسی قوم کے افراد ہیں' اور خاص طور پر ان کی اصل قوت یعنی نوجوان نسل تو ہے بھی قیام پاکستان کے بعد معرض وجود میں آنے والی۔ تو پھر ان میں اس ذہنی بے راہ روی کے پیدا ہونے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ کیا یہ ذمہ داری سب سے بڑھ کر ان لوگوں پر عائد نہیں ہوتی جو بزعم خویش اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی علمبرداری فرماتے رہے لیکن جنہوں نے تمام زور ''برسر اقتدار طبقہ'' پر تنقید کرنے میں ضائع کردیا اور قوتوں' صلاحیتوں اور اوقات کا سارا سرمایہ صرف سیاسی جدوجہد کے نذر کردیا اور تعلیم و تربیت کے کام سے یکسر نگاہیں پھیر لیں؟ چنانچہ نہ قوم کی ذہنی و فکری رہنمائی ہو سکی نہ اخلاقی و عملی تربیت' اور صورت یہ ہو گئی کہ نوجوان نسل میں سے جو جتنا زیادہ ذہین تھا اتنا ہی زیادہ تیزی سے الحاد و مادہ پرستی کی جانب جھکتا چلا گیا۔ پھر اگر آج یہ نسل خالص مادہ پرستی کی عینک سے معاملات کو دیکھتی ہے تو آخر قصور کس کا ہے؟ دوسرے مذہبی طبقات کو تو چھوڑیے کہ سب ہی کا خیال ہے کہ ان میں جدید نسل کی ذہنی رہنمائی کی صلاحیت موجود نہیں' سوال یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے پاکستان کے

۲۳ سالوں کے دوران کیا کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی تحریک کو اتنی طویل مہلت کار کا مل جانا بڑی ہی غیر معمولی خوش قسمتی شمار کی جا سکتی ہے' اور تاریخ اس جماعت کا یقینا شدید محاسبہ کرے گی جسے اتنی مہلت ملی لیکن اس نے اپنے آپ کو دور از کار معاملات میں الجھائے رکھا۔ سیاسی مہمیں تو چلائیں لیکن نہ ذہن و فکر کی دنیا میں انقلاب برپا کیا اور نہ اخلاق و کردار کی وادیوں میں کوئی تبدیلی پیدا کی۔ چنانچہ اب اپنی ہی ''غفلتوں کے شاخسانوں'' سے دو چار ہے!

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ کیا اس قسم کی سیاسی ہنگامہ آرائی اور نعرہ بازی سے جیسی کہ آج کل

مذہبی طبقات کی طرف سے ''سوشلزم'' کے مقابلے میں کی جا رہی ہے' کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اس لیے کہ یہ تو شاید ممکن ہو کہ اس طرح ان سیاسی جماعتوں کی پیش قدمی کو آپ کچھ دیر کے لیے روک دیں جو اپنی حصول اقتدار کی جنگ میں پیٹ کے نعرے کو اچھال رہی ہیں لیکن اس کی ہرگز کوئی امید نہیں کی جا سکتی کہ اس طریقے پر کسی ایک ذہن کو بھی بدلا جا سکے اور کسی ایک شخص کے فکر کے رخ کو بھی تبدیل کیا جا سکے۔ گویا یہ سارا ''جہاد'' ان لوگوں کے خلاف تو شاید کسی حد تک نتیجہ خیز ثابت ہو سکے جنہیں Pseudo Socialist کہا جاتا ہے' لیکن جو لوگ حقیقتاً سوشلسٹ ہیں اور جن کی زندگی کا مقصد ہی سوشلسٹ اور کمیونسٹ انقلاب برپا کرنا ہے اور جو واقعتا موجودہ انقلابی رو کی ذہنی و فکری رہنمائی کر رہے ہیں ان کے خلاف یہ ساری مہم قطعاً لاحاصل اور بے کارِ محض ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرز کی نعرہ بازی سے ایسے لوگ اپنے موقف پر مزید جازم اور اپنے نقطہ نظر میں مزید پختہ ہوتے چلے جا رہے ہیں اور دین و مذہب کا رہا سہا اخلاقی وقار بھی خاک میں ملتا چلا جا رہا ہے۔

ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہماری اس بار بار کی مرثیہ خوانی کا حاصل کچھ بھی نہیں' اس لیے کہ ملکی سیاست کے میدان میں برسرکار مذہبی جماعتوں کے لیے اب طریق کار کی تبدیلی قطعاً ناممکن ہے۔ ان کی ایک بڑی تعداد تو جو کچھ کر رہی ہے' اس کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ جن سے توقع ہو سکتی تھی وہ خود ہی اپنی غلط منطق کے صغریٰ کبریٰ کے جال میں اس درجہ پھنس چکے ہیں کہ اب اس سے ان کا رہائی پانا ممکن نہیں رہا۔ بنا بریں اکثر گمان ہوتا ہے کہ ہماری ساری قیل و قال بے کار اور سعی لاحاصل ہے۔

لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کیا واقعی اتنے بڑے ملک اور اتنی عظیم قوم میں چند لوگ بھی ایسے

نہیں جو وقتی طور پر سیاست کے اتار چڑھاؤ سے صرف نظر کر کے دین و مذہب کی بنیادی اقدار کے احیاء کے لیے بالکل بنیادی اور اساسی کام میں منہمک ہو سکیں... تو دل گواہی دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ غالباً ساری کمی ہمارے اپنے جذبِ دروں کی' اور اصل کوتاہی ہمارے بیانِ مطلب اور ادائے مدعا کی ہے اور اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ بارگاہِ ایزدی ہی میں درخواست کی جائے کہ {رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ﴿۲۵﴾ وَ یَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ﴿۲۶﴾ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ﴿۲۷﴾ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ﴿۲۸﴾} !

ہمارے اسی باطنی اضطراب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بار بار خیال آتا ہے کہ ''یثاق'' کو بند کر دیا جائے تاکہ سیاسی میدان سے بالکل لاتعلق ہونے کے باوجود محض اس کے صفحات میں جو سیاسی تبصرے کبھی کبھی آجاتے ہیں ان کا سلسلہ بھی بند ہو جائے اور ہم اپنی صلاحیتوں کی حقیر سی پونجی کو کامل یکسوئی کے ساتھ صرف علومِ قرآنی کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلم قرآن میں کھپا دیں۔ تاہم ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہوگا ؎

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا !

* * *

باب نہم

''... وقت دعا ہے !''

باب نہم

''... وقت دعا ہے !''

دسمبر ۱۹۷۱ء

ان سطور کی تحریر کے وقت مشرقی پاکستان پر بھارت کا باقاعدہ حملہ شروع ہوئے بیس روز ہو چکے ہیں اور مغربی پاکستان اور بھارت کے مابین جنگ شروع ہوئے بھی آٹھ دن ہو چکے ہیں۔ اس وقت دونوں محاذوں پر میدانی جنگ بھی نہایت گھمسان کی ہو رہی ہے اور دونوں ملکوں کی بحری و فضائی قوتوں میں بھی خوف ناک ٹکراؤ جاری ہے۔ ادھر اقوامِ متحدہ میں بھی گفت و شنید کا سلسلہ چل رہا ہے اور دنیا بھر کے تمام اہم دارالسلطنتوں کی توجہات بھی برصغیر پر مرتکز ہیں۔

کل کیا ہوگا وہ {وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا ط}(۱)

کے مصداق کسی کو معلوم نہیں اور اس جنگ کا مجموعی نتیجہ کیا نکلے گا وہ بھی {وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِھِمْ رَبُّھُمْ رَشَدًا ﴿۱۰﴾}(۲)

کے مصداق کسی کے علم میں نہیں ! حتیٰ کہ یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ جنگ کے خاتمے سے قبل یہ سطور بھی طبع ہو کر

قارئین تک پہنچ پاتی ہیں یا نہیں !

تاہم ایک بات بالکل واضح ہے کہ پاکستان کے وجود اور بقا کے لیے یہ جنگ فیصلہ کن ہے اور ہر پاکستانی مسلمان کے لیے یہ وقت جان کی بازی کھیل جانے کا ہے' اور ساتھ ہی چونکہ پاکستان کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی فضل ہی تھا اور اس کا اب تک قائم رہنا بھی اسی کے رحم و کرم کا نتیجہ ہے لہٰذا ہر پاکستانی کو بارگاہ خداوندی میں صدق دل سے دعا بھی کرنی چاہیے۔

لیکن واضح رہنا چاہیے کہ دعا بس کچھ رٹے ہوئے الفاظ کے زبانوں سے ادا کر دینے کا نام نہیں

---

(۱) ''اور نہیں جانتا کوئی ذی نفس کہ وہ کل کو کیا کمائے گا۔'' (سورۂ لقمان: آیت ۳۴)

(۲) ''اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کی شامت آ گئی ہے یا ان کا رب ان پر کرم فرمائی کا ارادہ رکھتا ہے۔'' (سورۃ الجن: آیت ۱۰)

ہے بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ ہر وہ شخص جو خدا کی رحمت کو پکارنا اور اس کی تائید و نصرت کو آواز دینا چاہے' پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے کہ خود اس نے اپنے پروردگار سے کوئی وفادارانہ رشتہ بھی استوار کیا یا نہیں؟ خود اس نے اس کے دین کے ساتھ خلوص و اخلاص کا معاملہ کیا یا نہیں؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا تو واضح فرمان یہ ہے کہ {اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ وَ یُثَبِّتۡ اَقۡدَامَکُمۡ ﴿۷﴾}(۳)

واقعہ یہ ہے کہ ہم نے پاکستان ایسی نعمت غیر مترقبہ اور دولت خداداد کی نہ کوئی قدر کی اور نہ ہی اس کا کوئی حق ادا کیا اور ہم بحیثیت قوم عدالت خداوندی میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں اور اب بھی کوئی آثار ایسے موجود نہیں کہ یہ امید کی جا سکے کہ ہماری اجتماعی زندگی کا دھارا دین کی طرف مڑ سکے گا۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ کوئی بھی فرد اس پوزیشن میں نہیں کہ پوری قوم کی جانب سے بارگاہِ خداوندی میں {اِنَّا ہُدۡنَاۤ اِلَیۡکَ ؕ}(۴)

کا توبہ نامہ پیش کر کے {اَتُہۡلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَہَآءُ مِنَّا ۚ}(۵)

کی استفہامی درخواست اور دعا پیش کر سکے' ہاں ایک بات ممکن ہے اور وہ یہ کہ:

ہر وہ شخص جو واقعتا صدقِ دل سے خدا کی رحمت کو پکارنا اور اس کی تائید و نصرت کو آواز دینا چاہتا ہو' پہلے بارگاہِ خداوندی میں اپنے تمام گناہوں پر صدق دل سے اظہارِ ندامت بھی کرے اور عزمِ توبہ بھی! اور پھر یہ عہد کرے کہ کم از کم اس کی اپنی زندگی اور اس کے بیشتر اوقات اس کے دین کی نصرت کے لیے وقف رہیں گے اور اس کی قوتوں' صلاحیتوں اور توانائیوں کا بہتر اور اکثر حصہ اللہ کی ہدایت

(۳) ''اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا۔'' (سورۂ محمدؐ: آیت ۷)
(۴) ''ہم تیری ہی جانب رجوع کرتے ہیں!'' (سورۃ الاعراف: آیت ۱۵۶)
(۵) ''کیا تو ہمیں ہمارے ناسمجھ لوگوں کے کرتوتوں کے سبب ہلاک فرما دے گا۔'' (سورۃ الاعراف: آیت ۱۵۵)

لکی نشر و اشاعت اور اس کے دین کے غلبے کے مقصد میں صرف ہو گا اور وہ پاکستان میں ایک صحیح معنی میں اسلامی معاشرہ اور حقیقی معنوں میں اسلامی ریاست کے قیام کو اپنی زندگی کا اصل نصب العین بنائے رکھے گا۔ تب اگر وہ اللہ تعالیٰ سے پاکستان کی سلامتی کی دعا کرے گا تو وہ یقینا مقبول ہوگی۔ راقم خود اسی عزم اور ارادے کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں پاکستان کی فتح کی درخواست پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی جاننا چاہتا ہے کہ کون ہیں وہ لوگ جو اس عزم اور ارادے میں اس کے ساتھ ہیں۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ۔ آمین یا رب العالمین۔

باب دہم

۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء تک
پاکستانی سیاست کی افراتفری کا اندوہ ناک نتیجہ
مشرقی پاکستان کی علیحدگی

باب دہم

۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء تک

پاکستانی سیاست کی افراتفری

کا اندوہ ناک نتیجہ

مشرقی پاکستان کی علیحدگی

جنوری‘ فروری ۱۹۷۲ء

دسمبر ۱۹۷۱ء کا شمارہ پاک ہند جنگ کے دوران شائع ہوا تھا اور اس کے ’’تذکرہ و تبصرہ‘‘ میں ہم نے ’’...وقت ِدعا ہے !‘‘ کے عنوان سے عرض کیا تھا کہ

’’کل کیا ہوگا وہ {وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا ؕ} کے مصداق کسی کو معلوم نہیں اور اس جنگ کا مجموعی نتیجہ کیا نکلے گا وہ بھی {وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِھِمْ رَبُّھُمْ رَشَدًا ﴿۱۰﴾} کے مصداق کسی کے علم میں نہیں !

اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے تو نہیں تھے جو ’’فتح لازماً ہماری ہوگی !‘‘ اور ’’ہم عید کی نماز دہلی اور کلکتہ میں پڑھیں گے !‘‘کی قسم کی بڑیں ہانکتے تھے‘تاہم اس اقرار میں ہمیں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ ایسی ذلّت آمیز شکست کا ہمیں تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کی مخصوص جغرافیائی پوزیشن کے سبب سے یہ خدشہ تو ہمیں کبھی کبھی ہوتا تھا کہ کہیں مشرقی پاکستان ہماری فوج کا قبرستان نہ بن جائے (چنانچہ مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے یاد دلایا کہ بالکل انہی الفاظ میں ایک بار راقم نے اس خدشے کا اظہار ان کے سامنے کیا تھا) لیکن یہ کبھی تصور میں بھی نہ آسکتا تھا کہ مشرقی پاکستان عالم ارضی کی سب سے بڑی مسلمان مملکت کی عزت و ناموس کی شمشان بھومی کی صورت اختیار کرلے گا اور ایک ایسی فوج کے ایک لاکھ کے لگ بھگ جوان اور افسر انتہائی ذلت کے ساتھ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے جس کی شجاعت کا ڈنکا صرف عالمِ اسلام ہی میں نہیں پوری دنیا میں بجتا ہے اور جس کی بہادری کے اپنے ہی نہیں دشمن بھی معترف ہیں۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ مشرقی پاکستان سے گرفتار کرکے بھارت لے جائے جانے والے لوگوں میں ریگولر فوجی تینتالیس ہزار تھے‘باقی سویلین لوگ تھے !)

بنی اسرائیل کی تاریخ کے دوران کئی بار ایسا ہوا کہ انہیں دشمنوں کے ہاتھوں عبرت ناک شکستیں اٹھانی پڑیں۔ تاریخ کے اوراق میں ایسے کئی مواقع کی داستانیں تفصیل کے ساتھ محفوظ ہیں۔ چنانچہ جب کبھی پڑھنے میں آتا کہ اس طرح کے مواقع پر کئی کئی لاکھ کی تعداد میں یہودی مرد ‘عورتیں اور بچے اسیر بنا لیے جاتے تھے تو حیرت ہوتی تھی کہ کیا واقعی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک قوم ابھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہو لیکن اسیری کی ذلت کو قبول کرلے‘ اور جیسا کہ نبوکد نصر کے حملے کے بعد ہوا‘ بالکل بھیڑ بکریوں اور ڈھور ڈنگروں کی طرح لاکھوں کی تعداد میں ہنکا کر ایک ملک سے دوسرے کو لے جائی جائے ! افسوس کہ ملت اسلامیہ پاکستان نے اپنی آنکھوں سے جیتے جی یہ منظر دیکھ لیا کہ اس کے ایک لاکھ کے لگ بھگ کڑیل افراد نے نہ صرف یہ کہ انتہائی ذلت آمیز طریقے پر دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالے بلکہ انہیں اس حال میں ’’بنگلہ دیش‘‘ سے بھارت منتقل کیا گیا کہ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اس حادثہ فاجعہ پر جو کرب والم نہ صرف مسلمانانِ پاکستان بلکہ مسلمانان عالم نے محسوس کیا ہے ‘حقیقت یہ ہے کہ وہ بیان سے باہر ہے۔ کتنے ہی لوگوں کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ کاش کہ ہماری فوج ایک ایک کرکے کٹ مرتی لیکن ہتھیار نہ ڈالتی۔ ہر شخص اپنے دل میں رنج و غم کا ایک بند طوفان لیے پھرتا ہے اور پوری قوم کے احساسات میں تلخی کا زہر گھل کر رہ گیا ہے۔

کاش کہ اس موقع پر قوم کو کوئی ’’زبان‘‘ میسر ہوتی جو اس کے احساسات کی ترجمانی کرکے اس کے دل کے بوجھ کو کسی قدر ہلکا کردیتی۔ قومی اور ملی سطح پر ہماری تہی دامنی کا عالم یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس ایسی کوئی ’’زبان‘‘ بھی موجود نہیں۔ بغداد کی تباہی پر جو نوحے شیخ سعدی نے کہے تھے ان سے اس وقت نہ معلوم کتنے لوگوں کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا ہوگا۔ ان کا یہ شعر جو زبان زدِ خاص و عام ہے ‘ان کے اپنے احساسات کی شدت کا کس درجہ غماز ہے کہ ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنیں

پھر جب دولت ِہسپانیہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھنی تو بقول علامہ اقبال ؎

آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

پھر جب دہلی پر قیامت ٹوٹی تو علامہ اقبال ہی کے الفاظ میں ''داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر!'' یہاں تک کہ اسی صدی میں شمالی افریقہ پر یورپی استعمار کے مظالم پر علامہ شبلی نے دردناک مرثیے کہے اور خود علامہ اقبال نے جزیرہ صقلیہ (سسلی) پر بایں الفاظ نوحہ کہا کہ ؎

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

لیکن افسوس کہ آج حال یہ ہے کہ روئے ارض کی عظیم ترین مسلمان مملکت پر قیامت گزر گئی، پھر بھی کوئی ایسا نالہ کسی جانب سے سننے میں نہیں آیا جو قوم کی آواز قرار پاتا اور جسے سن کر قوم محسوس کرتی کہ کم از کم اس کے جذبات کا اظہار تو ہوگیا۔ ان حالات میں بے ساختہ نوکِ قلم پر حضور ﷺ کے وہ الفاظِ مبارک آتے ہیں جو آپؐ کی زبان مبارک سے غزوۂ اُحد کے بعد مدینہ منورہ واپس تشریف لانے پر جوشِ گریہ سے نکلے تھے کہ ''اَمَّا حَمْزَۃُ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ!'' ''ہائے! حمزہ کے لیے رونے والیاں بھی نہیں!'' بالکل اسی طرح حقیقت یہ ہے کہ آج سقوطِ مشرقی پاکستان کا رونے والا بھی کوئی موجود نہیں۔

یہ رونا رلانا واقعہ یہ ہے کہ محض رسمی نہیں ہوتا بلکہ اس سے حقیقتاً قوم کے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور ذہن کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے۔ ورنہ بسا اوقات اس طرح کے صدمے اندر کی اس بند چوٹ کے مانند جو کسی مریض کو اندر ہی اندر ختم کردیتی ہے، کسی قوم کو بالکل کھوکھلا کرکے رکھ دیتے ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ سقوطِ مشرقی پاکستان پر قوم کے جذبات کا اظہار نہ ہوسکنے کے باعث اندر ہی اندر کا صدمہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کے جذبہ خود اعتمادی کو گھن کی طرح چٹ کر رہا ہے اور عوام کی اکثریت نہ صرف یہ کہ اس طرح کے خیالات میں غلطاں وپیچاں ہے کہ آیا ہماری کوئی حقیقی بنیاد ہے بھی کہ نہیں، اور آئندہ بقیہ ملک بھی قائم رہ سکے گا یا نہیں، بلکہ لوگ یہاں تک سوچنے لگے ہیں کہ کیا واقعی پاکستان کا قیام درست اور صحیح تھا! کہیں ایسا تو نہیں کہ پاکستان کا قیام ہی ایک غلطی ہو اور اب تاریخ کے بے رحم ہاتھ اس غلطی کی جبری اصلاح کے درپے ہوچکے ہوں؟

یہ صورت حال بہت مشابہ ہے اس کیفیت سے جو زلزلے کے کسی جھٹکے کے بعد اعصاب پر طاری ہوتی ہے، یعنی یہ کہ انسان ہل کر رہ جاتا ہے اور اسے نہ اپنے نیچے زمین ہی محسوس ہوتی ہے نہ

سر پر آسمان بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ فضا میں معلق ہو۔ پھر یہ حالت زلزلے کے جھٹکے کے بعد فوراً ختم نہیں ہوجاتی بلکہ دیر تک طاری رہتی ہے، اور انسان بہت دیر تک غیر یقینی کی سی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔

اس صورت حال میں اس چیز کی شدید ضرورت ہے کہ رنج و الم اور درد و کرب کے احساسات کو زبانِ اظہار عطا کرنے کے ساتھ ساتھ سنجیدگی سے تجزیہ بھی کیا جائے کہ جو کچھ پیش آیا اس کے اسباب کیا تھے۔ حقیقی غلطی کہاں تھی اور کتنی تھی‘ بلکہ یہ بھی کہ یہ واقعہ جو پیش آیا ہے وہ حقیقت میں ہے کیا؟ اس سے ہماری کمزوریاں اور خامیاں ظاہر ہوئی ہیں تو کون سی؟ تاکہ قوم پر بحیثیت مجموعی نا امیدی اور مایوسی کی جو کیفیت طاری ہوگئی ہے وہ ختم ہو اور بے اعتمادی اور غیر یقینی کے بادل جو ملک و ملت کی فضا پر چھا گئے ہیں وہ چھٹ جائیں۔

ہمارے نزدیک ''سقوطِ مشرقی پاکستان'' ایک حادثہ نہیں بلکہ دو واقعات کا مجموعہ ہے‘ اور کسی حقیقی تجزیئے کے لیے لازمی ہے کہ ان دونوں پر آغاز ہی سے علیحدہ علیحدہ غور کیا جائے۔ ان میں سے ایک ہے مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی اور وہاں ایک نئی خود مختار مملکت کا بنگلہ دیش کے نام سے قیام‘ اور دوسرا ہے پاک ہند جنگ میں پاکستان کی ذلت آمیز شکست اور عبرت ناک ہزیمت۔ ان دونوں حوادث کے جمع ہوجانے اور یک وقت وقوع پذیر ہونے کو چاہے روایتی طور پر اپنی بد قسمتی پر محمول کرلیا جائے‘ چاہے چند افراد کی نا اہلی اور بے تدبیری یا غداری پر‘ چاہے پوری قوم کی سیاسی بے شعوری اور اجتماعی نابالغی پر‘ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ یہ ہیں دو بالکل جدا حادثات اور انہیں گڈ مڈ کرنا کسی طور پر درست نہیں‘ اس لیے کہ اس حادثے کی اصل تلخی دوسرے جزو سے متعلق ہے نہ کہ پہلے سے!

جہاں تک مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کا تعلق ہے‘ اس سے پہلے کہ ہم اس واقعے پر اپنا حالیہ ''تبصرہ'' پیش کریں‘ مناسب ہے کہ آج سے دو ڈھائی سال قبل جولائی ۱۹۶۹ء کے ''تذکرہ و تبصرہ'' میں ہم نے اس مسئلے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اسے دوبارہ قارئین کی خدمت میں پیش کردیں۔

اس ''تذکرہ و تبصرہ'' کا آغاز ہم نے بانی پاکستان محمد علی جناح مرحوم کے اس مشہور فقرے سے کیا تھا کہ:

God has given us a golden opportunity to show our worth as architects of a new nation (or state?) and let it not be said that we did not prove equal to the task!

اور اس کے بعد عرض کیا تھا کہ: ''افسوس کہ آج جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے بائیس سال ہونے کو آئے اور خود محمد علی جناح مرحوم کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا‘ مملکت خداداد پاکستان بزبانِ حال نوحہ خواں ہے کہ اس کے بانی و مؤسس کا خدشہ صحیح ثابت ہوا اور اس نئی مملکت کو وہ معمار میسر نہ آسکے جو ایک انگریز شاعر کے قول کے مطابق ''اس کے ستونوں کو نہایت گہری اور پختہ بنیادوں سے اٹھاتے اور پھر تعمیر کرتے ہوئے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتے!''

پھر اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے اسباب میں سے ''تین تاریخی عوامل'' پر گفتگو کی

تھی اور تین ایسی ''پیچیدگیوں'' کا ذکر کیا تھا جو قیام پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہوگئی تھیں اور گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہیں اور جن کا الجھاؤ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ پھر ان میں سے ایک کے بارے میں عرض کیا تھا کہ:

''ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین پیچیدگی خالص جغرافیائی ہے یعنی یہ کہ مملکت ِخداداد پاکستان دو ایسے علیحدہ اور دُور دراز خطوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع ہوئے ہیں اور جن کے مابین ایک ایسی مملکت حائل ہے جو حالت جنگ ہی میں نہیں عین حالت امن میں بھی ایک بالقوہ دشمن (potential enemy) کی حیثیت رکھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یوں تو اگرچہ پاکستان کا وجود ہر اعتبار سے ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن خاص اس اعتبار ہی سے تو یہ تاریخ عالم کا ایک نہایت ہی انوکھا اور محیر العقول تجربہ ہے جس کی شاید ہی کوئی دوسری نظیر کبھی موجود رہی ہو۔

یہ جغرافیائی پیچیدگی بجائے خود بھی کچھ کم اہم اور الجھی ہوئی نہ تھی، لیکن دو مزید عوامل نے اس کے الجھاؤ کو دوگونہ کردیا ہے۔ ایک اس حقیقت نے کہ تہذیب، تمدن، زبان، لباس،

طرزِ بودوباش اور جذباتی و ذہنی ساخت غرض ایک مذہب کے سوا ہر اعتبار سے ان دو خطوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اگر دین و مذہب کے سوال کو خارج از بحث کردیا جائے تو دنیا کے مروجہ معیارات میں سے کسی معیار کے اعتبار سے بھی انہیں ایک قوم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دوسرے اس واقعے نے کہ ان دو خطوں میں سے جو خطہ رقبہ، محل وقوع، دفاع اور تعمیر و ترقی کے امکانات الغرض تمام اعتبارات سے اہم تر ہے وہ بلحاظ آبادی کم تر ہے اور دوسرا خطہ جو نہ صرف یہ کہ ان تمام اہم امور کے اعتبار سے بہرحال ثانوی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ایک نہایت جان دار، فعال، سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ غرض ہر اعتبار سے نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی اقلیت کی اضافی پیچیدگی بھی لیے ہوئے ہے، تعدادِ نفوسِ انسانی کے لحاظ سے دوسرے خطے سے برتر ہے۔ ذرا دِقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دو اضافی عوامل کی بنا پر اس خالص جغرافیائی اشکال نے ایک نہایت پیچیدہ مسئلے کی صورت اختیار کرلی ہے۔

اور یہ اسی پیچیدگی اور اشکال کا نتیجہ ہے کہ بائیس سال کی طویل مدت میں بھی پاکستان کا کوئی دستور نہیں بن سکا اور دستور سازی کے میدان میں نہ صرف یہ کہ ہنوز روز اول کا معاملہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دُور دُور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جارہا ہے!

اس اشکال اور الجھاؤ کا مستقل حل تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبہ کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائیدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا۔ تاہم فوری

طور پر بعض دوسری چیزیں بھی پیش نظر رہنی ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اس ''سنجوگ'' کا برقرار رہنا مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی ہی پر منحصر ہے اور اسے کسی طرح بھی ان پر ٹھونسا نہیں جا سکتا' بلکہ اس معاملے میں جبر و تشدد کا رد عمل نہایت خوف ناک ہوسکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس ''آزاد مرضی'' کا انحصار بھی جتنا کچھ دینی جذبات اور ملی احساسات پر ہے

اتنا ہی اس امر پر بھی ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ہمارے ساتھ کوئی نا انصافی نہیں ہو رہی بلکہ مثبت طور پر انہیں یہ احساس بھی ہو کہ خود ان کا مفاد مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے ہی سے وابستہ ہے' اور مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ رہ کر ہی دنیا میں ایک باعزت اور باوقار آزاد مملکت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ مزید بر آں یہ کہ اگر خدانخواستہ کبھی ''علیحدگی'' کی صورت پیدا ہوئی تو مغربی پاکستان کے لیے تو پھر بھی امکانِ غالب موجود ہے کہ وہ اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھ سکے گا' لیکن مشرقی پاکستان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ کسی دوسری وسیع تر قومیت میں ضم اور کسی دوسری بڑی مملکت میں جذب ہوکر رہ جائے۔

ان دو امور کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہیے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی مرضی در اصل ہے کیا؟ اگر وہ واقعتاً مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی اس خواہش کے آڑے نہیں آسکتی۔ بین الانسانی علائق میں سب سے زیادہ مقدس رشتہ میاں اور بیوی کا ہوتا ہے لیکن اس میں بھی دین فطرت نے علیحدگی کی ایک سبیل رکھ دی ہے اور صاف ہدایت کی ہے اگرچہ طلاق حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے تا ہم ''معلق'' رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ علیحدگی اختیار کرلی جائے۔ بالکل اسی طرح اگر ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی واقعتاً یہ محسوس کرتے ہوں کہ مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے میں انہیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے تو ان کی بے اطمینانی کے سبب سے پورے ملک کی سیاسی و دستوری زندگی کو مسلسل ''معطل'' رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کی مرضی کو بروئے کار آنے کا موقع دے دیا جائے۔''

اس قدر طویل اقتباس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی حادثے کے وقوع پذیر ہوجانے کے بعد تو ہر شخص ہی پنڈت بن جاتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اپنی اس تحریر میں اس ''اشکال اور الجھاؤ'' کے جس مستقل حل کی طرف اشارہ کیا تھا یعنی یہ کہ: ''دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبے کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائیدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا'' وہ تو نہ ہونا

تھا نہ ہوا البتہ جتنی قابل حذر چیزوں کا ذکر ہم نے کیا تھا‘شامت اعمال سے وہ سب کی سب بدترین صورتوں میں رونما ہوکر رہیں۔

149

چنانچہ جب یہ کمزور رشتہ کمزور تر ہوتا نظر آیا تو نہ تو ’’مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی‘‘ کو بروئے کار آنے کا موقع دیا گیا نہ ان سے سیدھی طرح بات ہی کی گئی بلکہ اس کے برعکس ’’جبروتشدد‘‘ کی راہ اختیار کی گئی اور دفعۃً طاقت و قوت کا سخت ترین استعمال کر لیا گیا۔ نتیجتاً اس کا ردِّعمل بھی ’’نہایت خوف ناک‘‘ صورت میں سامنے آیا۔ آج ہم اس صورت حال سے دوچار ہیں کہ ایک طرف مغربی پاکستان کے عوام کی گردنیں شدید ترین احساسِ ذلت و رسوائی سے جھکی ہوئی ہیں اور ان کی آنکھوں میں مایوسی اور دل شکستگی کے مہیب سائے ڈیرہ ڈالے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف وہ حسین و زرخیز اور سرسبز و شاداب خطہ جسے دنیا ربع صدی تک ’’مشرقی پاکستان‘‘ کے نام سے جانتی رہی ہے نہ صرف یہ کہ ہم سے کٹ گیا ہے بلکہ اس وقت دشمن کے قبضے میں ہے اور اس بات کا حقیقی خطرہ موجود ہے کہ کہیں وہ مستقل طور پر ’’مہابھارت‘‘ میں ضم اور ہندی قومیت میں ’’جذب‘‘ ہوکر نہ رہ جائے۔ (پ ن: واقعہ یہ ہے کہ یہ اللہ کے بہت بڑے فضل و کرم کا مظہر ہے کہ ہمارے یہ اندیشے غلط ثابت ہوئے اور آج بحمد اللہ بنگلہ دیش ایک آزاد و خود مختار ملک کی حیثیت سے موجود ہے‘جہاں نہ صرف یہ کہ مسلمان عظیم اکثریت میں ہیں بلکہ دینی احساسات کے اعتبار سے بھی دنیا کے کسی اور خطے کے مسلمانوں سے پیچھے یا کم تر نہیں ہیں!)

حقیقت یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد پاکستان میں جو حالات و واقعات رونما ہوئے وہ ہمارے سابق حکمران ٹولے کی شدید نا اہلی اور انتہائی بے بصیرتی و بے تدبیری حتیٰ کہ بدنیتی اور بددیانتی کے شاہکار تو ہیں ہی‘مجموعی اعتبار سے ہماری پوری قوم کے سیاسی افلاس کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ہم نے گزشتہ پورے سال کے دوران اس موضوع پر بالکل قلم نہیں اٹھایا کہ مارشل لاء کی تلوار سر پر لٹکی ہوئی تھی اور زبان و قلم پر سخت پہرے قائم تھے۔ چنانچہ ستمبر‘ اکتوبر ۱۹۷۱ء کے ’’تذکرہ و تبصرہ‘‘ میں ہم نے عرض بھی کر دیا تھا کہ:

’’جہاں تک ملکی حالات کا تعلق ہے‘ان پر کچھ لکھنے پر ابھی طبیعت بالکل آمادہ نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ بحالات موجودہ پورا سچ (Whole Truth) کہنا ممکن نہیں اور جزوی صداقت (Half Truth) کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ وہ بسا اوقات جھوٹ اور کذب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لہٰذا جب تک قلم غیر معمولی حالات کی بنا پر عائد شدہ پابندیوں سے آزاد نہیں ہوجاتا‘ہم منقار زیر پر رہنے ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔‘‘

150

ہماری حتمی رائے جو مندرجہ بالا اقتباس کے بین السطور میں بھی موجود ہے‘یہ ہے کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کو ابتدا ہی سے ایک ملک متصور کرکے سفر کا آغاز اگرچہ نہایت خلوص کے ساتھ اور in absolute good

faith ہوا تھا ‘تاہم تھی یہ ایک غلطی۔ اس کے برعکس صحیح شکل وہی تھی جس کی جانب مشہور و معروف قرار دادِ لاہور میں اشارہ کیا گیا تھا ‘یعنی یہ کہ جغرافیائی حقائق کا منہ چڑانے کی بجائے ان کا مناسب لحاظ کیا جاتا اور ان دونوں خطوں کو ابتدا ہی سے دو آزاد اور خود مختار ملک تصور کرکے سفر کا آغاز کیا جاتا۔ اس صورت میں غالب امکان یہی تھا کہ ایک طرف تو یہ دونوں ملک بھارت کی مشترک دشمنی کے زیر اثر آپ سے آپ بغیر کسی بیرونی دباؤ کے ایک دوسرے کے ساتھ نہایت قریبی تعاون اور اشتراکِ عمل رکھنے پر مجبور ہوتے اور دوسری طرف مشرقی پاکستان میں مقامی ہندو سرمایہ داروں کے غریب مسلمان عوام کے معاشی استحصال کا وہ احساس وشعور بھی برقرار رہتا جو پاکستان کے وجود میں آنے کا اصل اور بنیادی محرک بنا تھا۔ لیکن افسوس کہ ہم بحیثیت قوم چاہے خالص عارضی اور محض وقتی طور پر ہی سہی بہرحال آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل کے زمانہ میں ’’جذبۂ ملی‘‘ سے اس درجہ سرشار ہوگئے تھے کہ نہایت ٹھوس حقائق بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے اور ہم نے ان دونوں دور دراز خطوں کا ’’سنجوگ‘‘ ایک متحدہ ملک کی صورت میں قائم کردیا۔ یہ دراصل قومی سطح پر ہمارے سیاسی افلاس کا نہایت نمایاں مظہر اور ہمارے قومی مزاج کی ’’جذباتیت‘‘ کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر بحیثیت قوم ہم میں کچھ بھی سیاسی شعور ہوتا تو ہم بہت جلد اس غلطی کا احساس و ادراک کرلیتے۔ اس لیے کہ خان لیاقت علی خان مرحوم کی بی پی سی رپورٹ کا حد درجہ حسرت ناک انجام اسی لیے ہوا تھا کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کے مابین بندھن کے لیے کوئی قابلِ قبول دستوری فارمولا تلاش نہ کیا جا سکا۔ لیکن ہماری ’’جذباتیت‘‘ اور حقائق سے گریز کی مستقل عادت پھر آڑے آئی اور ہم نے حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

اس کے بعد پاکستان میں حکومت کی سطح پر سازشوں اور انقلابوں کا جو چکر چلا اس کا اصل اور بنیادی سبب تو اگرچہ یہ تھا کہ یہاں جو قوم آباد تھی وہ دفعۃً آزاد تو ہوگئی تھی لیکن اس کا سیاسی و اجتماعی شعور ابھی بالکل خام تھا اور یہاں قومی سطح پر نہ کوئی محکم تنظیم موجود تھی نہ مضبوط قیادت ‘البتہ اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ جب ملک کی کوئی دستوری اساس ہی قائم نہ ہوسکی تو لامحالہ ع

’خموشی گفتگو ہے‘ بے زبانی ہے زباں میری‘‘ کے مصداق بے دستوری ہی یہاں کا دستور اور بے آئینی ہی یہاں کا آئین قرار پایا۔ چنانچہ ملک و ملت کا سفینہ کچھ عرصہ تو سازشوں اور انقلابوں کے چھوٹے چھوٹے گردابوں میں ہچکولے کھاتا رہا اور بالآخر ایک بڑے بھنور میں آپھنسا ‘اور ایوب خاں کا گیارہ سالہ ’’سنہری دور‘‘ شروع ہوگیا جس کے دوران میں ’’صدارتی طرزِ حکومت‘‘ نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے سیاسی محرومی کے احساس کو نقطہ عروج پر پہنچا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ دورِ ایوبی میں مشرقی پاکستان میں صنعتی ترقی وغیرہ کی صورتوں میں وہاں کے عوام کی اشک شوئی اور دل جوئی کی بہت کوششیں بھی ہوئیں‘لیکن اس کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ان تمام کوششوں کے علی الرغم رفتہ رفتہ مشرقی پاکستان واقعتا مغربی پاکستان کی ’’نوآبادی‘‘ (colony) بنتا چلا گیا‘جس سے وہاں فطری طور پر سیاسی بے چینی مسلسل بڑھتی چلی گئی۔

اس صورت حال سے دشمن نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ ایک طرف مشرقی پاکستان کی اس ہندو اقلیت نے جلتی پر تیل ڈالا جو خود ہمارے الفاظ میں ’’نہایت جاندار‘ فعال‘ سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ غرض ہر اعتبار سے نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریئے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی تھی‘‘ اور جو وہاں زبان اور کلچر کی بنیاد پر جداگانہ قومیت کی اساس کو اجاگر کرنے کا کام بھی مسلسل بیس سال سے کر رہی تھی۔ ہندوؤں کو ابھی اس نہج پر کام کرکے کسی نتیجے پر پہنچنے میں یقیناً بہت مدت تک جدوجہد کرنی پڑتی لیکن اس سیاسی بے چینی نے ان کے لیے ایک سنہری موقع فراہم کردیا اور انہوں نے سیاسی محرومی کے احساس کو بآسانی مغربی پاکستان کے خلاف جذبہ نفرت (hate complex) میں تبدیل کر دیا۔ دوسری طرف ہمارے ’’عظیم ہمسائے‘‘ نے اس آگ کو نہ صرف ہوا دی اور بھڑکایا بلکہ اس کے لیے ہر طرح کا ایندھن بھی فراہم کیا۔ نتیجتاً علیحدگی پسندی کا ایک زبردست رجحان پیدا ہوا اور اس کے لیے ایک عوامی تحریک جڑ پکڑ گئی۔

۱۹۶۹ء میں دوسرے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اگرچہ حکومت وقت نے بہت سی ہمالیہ ایسی غلطیاں بھی کیں‘مثلاً یہ کہ مغربی پاکستان کی وحدت کو بلاوجہ ختم کردیا‘تاہم دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد تک بحیثیت مجموعی سابق صدر یحییٰ کی نیک نیتی پر شک کے لیے کوئی گنجائش موجود نہ تھی اور ان کا ملک کو ہنگاموں اور ایجی ٹیشنوں کی فضا سے نکال کر معروف سیاسی سرگرمی حتیٰ کہ عام

انتخابات کی راہ پر لے آنے میں کامیاب ہوجانا تو بلاشبہ بہت قابل قدر تھا‘لیکن اس کے بعد کی داستان نہایت تلخ ہے‘اور جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں ‘حکمران ٹولے کی شدید نا اہلی اور انتہائی بے بصیرتی اور بے تدبیری ہی نہیں بدنیتی اور بددیانتی کا عظیم شاہکار ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ’’سقوطِ مشرقی پاکستان‘‘ کے اصل تلخ جزو یعنی ہماری ذلت آمیز شکست اور عبرت ناک ذلت و رسوائی کے اسباب کا آغاز ہوتا ہے۔

دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتائج سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ مشرقی پاکستان نے بحیثیت مجموعی علیحدگی پسندگی کے حق میں واضح فیصلہ صادر کردیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی آزاد رائے کو عملاً بروئے کار آنے کا موقع دیا جاتا یا کم از کم یہ کہ ان سے واضح انداز میں بات کی جاتی اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی کہ حقیقتاً وہ چاہتے کیا ہیں! آیا مغربی پاکستان سے مکمل علیحدگی کے خواہاں ہیں یا کسی درجے کا کوئی بندھن قائم رکھنے پر

آمادہ ہوسکتے ہیں؟ راقم نے انتخابات کے نتائج مدینہ منورہ میں سنے تھے اور اسی وقت احباب سے عرض کردیا تھا کہ اب مشرقی اور مغربی پاکستان کو کوئی طاقت ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ ؎

ہر چہ دانا کند' کند ناداں
لیک بعد از خرابی بسیار!

کے مصداق یہ علیحدگی خوش اسلوبی سے نہ ہو بلکہ بھونڈے طریق پر ہو اور صرف خرابی ہی نہیں خون خرابے کے ساتھ ہو۔ ساتھ ہی بارگاہِ رب العزت میں دعا بھی کی تھی کہ ''پروردگار! پاکستان کے موجودہ فوجی حکمرانوں کو جنرل ڈیگال ہی کی سمجھ عطا فرما دے کہ وہ اس علیحدگی کو خوش اسلوبی کے ساتھ عمل میں لے آئیں! ''لیکن افسوس کہ ہماری یہ دعا بارگاہ رب العزت میں قبول نہ ہوئی اور قوم کے سیاسی افلاس اور اجتماعی شعور کے فقدان کے نتائج سامنے آکر رہے۔

اب یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ سابق صدر یحییٰ خان اور ان کے مشیروں کا ''عام انتخابات'' کے انعقاد کا کریڈٹ حاصل کرنے کا فیصلہ اس غلط اندازے پر مبنی تھا کہ دونوں خطوں میں چاہے کچھ بڑے بڑے گروپ بھی انتخابات جیت لیں لیکن اکثریت چھوٹے چھوٹے سیاسی گروپوں کی ہوگی جن کو مہرے بنا کر ہم سیاست کی شطرنج پر بازی کھیلتے رہیں گے۔ لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی کہ ان کے یہ اندازے غلط ثابت ہوئے۔ مغربی پاکستان میں تو پھر بھی

پیپلز پارٹی کے بڑے دھڑے کے ساتھ کچھ نہ کچھ چھوٹے گروپ بھی آگئے' لیکن مشرقی پاکستان میں تو ساری کی ساری سیٹیں عوامی لیگ نے حاصل کرلیں اور اس طرح شطرنج کی کسی بساط کے بچھنے کا امکان ہی موجود نہ رہا۔

بس یہیں سے بدنیتی کے اس سلسلے کا آغاز ہوگیا جو بالآخر انتہائی ذلت و رسوائی پر منتج ہوا۔ پہلے تو تین ماہ شش و پنج ہی میں گزار دیئے گئے' پھر اسمبلی کا اجلاس طلب بھی کیا گیا تو اس پیشگی اہتمام کے ساتھ کہ وہ بالفعل منعقد نہ ہونے پائے۔

اس مرحلہ پر پاکستان کے موجودہ صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر ذوالفقار علی بھٹو کا کردار بھی نہایت مشکوک اور حد درجہ تباہ کن ثابت ہوا۔ اب چاہے بھٹو صاحب اپنے اُس وقت کے موقف کی کیسی ہی خوش نما تاویلیں کرلیں' حقیقت یہ ہے کہ یہ داغ ان کے دامن پر ہمیشہ قائم رہے گا کہ چاہے دانستہ اس سازش میں شریک نہ رہے ہوں اور محض نادانستہ ہی استعمال ہوئے ہوں بہرحال ایک بہت بڑی تباہی کے اسباب میں شامل ضرور ہوگئے۔ ان کے بارے میں ہمارا اندازہ یہ تھا کہ ان کی جذباتی' سیماب وش' جلد باز اور volatile شخصیت

کے ظاہری خول کے اندر ایک سنجیدہ، حقیقت بیں اور ٹھوس calculating تشخصیت چھپی ہوئی ہے لیکن افسوس کہ مشرقی پاکستان کے معاملے میں انہوں نے کسی تدبر اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں دیا۔

اس مسئلے میں تھوڑا سا الزام ہماری رائے میں مغربی پاکستان کے دائیں بازو کے ان شکست خوردہ سیاست دانوں پر بھی آتا ہے جنہوں نے انتخابات کے فوراً بعد بھٹو دشمنی کے جذبات سے مغلوب ہوکر شیخ مجیب الرحمن کی مدح سرائی اور کاسہ لیسی شروع کردی اور اس طرح گویا بھٹو صاحب کو بالکل corner کردینے کی کوششیں شروع کردیں۔ ہمارے نزدیک یہ ان لوگوں کی بے تدبیری اور نا سمجھی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ لیکن اگر بھٹو صاحب کا رویہ ان کے اس طرز عمل کے رد عمل کے طور پر تھا تب بھی یہ بھٹو صاحب کے اپنے فہم اور تدبر کے دامن پر ایک بہت بڑا داغ ہے۔

بہرحال اسمبلی کے انتہائی تاخیر کے ساتھ طلب کیے جانے اور پھر ملتوی کردیئے جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے محسوس کیا کہ ہم اپنا مقصود آئینی طریق پر حاصل نہیں کرسکتے۔ چنانچہ حالات بگڑنے شروع ہوئے، قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا، جس پر پہلے تو حکومت

وقت نے نہایت پراسرار خاموشی اختیار کی اور پھر یکبارگی سخت ترین ملٹری ایکشن کا آغاز کردیا۔

اس کے بعد کی داستان نہایت طویل ہے، اور داستان سرائی یہاں مقصود نہیں۔ مختصراً یہ کہ ملٹری ایکشن کے نتیجے میں لاکھوں افراد گھر بار چھوڑ کر بھارت بھاگ گئے جسے بھارت نے اپنا مسئلہ بنا لیا۔ اس کے پردے میں پہلے گوریلے اور مسلح تخریب کار بھیج کر اور پھر براہ راست حملہ کرکے مشرقی پاکستان کے لیے فوری خطرہ پیدا کردیا اور پھر وہ چودہ روزہ جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں پاکستان کو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی اور مشرقی پاکستان ''بنگلہ دیش'' بن گیا۔

جہاں تک اس ''ذِلت آمیز شکست'' اور ''عبرت ناک ہزیمت'' کے اسباب کا تعلق ہے، اب تک اس موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ سے یہی ہمارے عوام کی گفتگوؤں کا موضوع بھی رہا ہے اور ''دانشوروں'' کے تجزیوں کا بھی۔ اب تو اس قضیے کے باقاعدہ تصفیے کے لیے ایک اعلیٰ سطح کا کمیشن بھی کام کر رہا ہے۔ تاہم اس مسئلے کے بعض پہلو ایسے ہیں جو عوام کی نظروں سے تو اوجھل ہیں ہی، ہمارے علم کی حد تک ''دانشوروں'' نے بھی کم از کم تاحال دانستہ یا نادانستہ ان سے اعراض ہی کیا ہے۔ رہا حمود الرحمن کمیشن تو غالباً یہ پہلو اس کے دائرہ تحقیق و تفتیش (scope) سے بھی باہر ہی رہیں گے۔ لہٰذا ہماری رائے میں ان صفحات میں ان کے جانب مختصر اشارہ مناسب رہے گا۔

اب تک جو کچھ کہا اور لکھا گیا ہے، اس کا مرکز و محور سابق صدر یحییٰ خان اور ان کے رفقائے کار فوجی

حکمران رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اس شکست کے فوری اسباب (exciting causes) بہرحال ان لوگوں کی شدید ترین نا اہلی، حد درجہ کی بے تدبیری اور بے بصیرتی، حوصلے کی کمی، قوت فیصلہ کے فقدان اور اعصاب کے ضعف کے گرد ہی گھومتے ہیں ۔یہ تمام چیزیں براہ راست نتیجہ ہیں ان کی عیاشیوں اور بدکاریوں کا اور ان کے کردار کی پستی، اخلاق کی دناء ت اور سیرت کے گھناؤنے پن کا۔ خمر تو کہتے ہی اسے ہیں جو عقل کو ڈھانپ لے (الخمر ما یخامر العقل) لہٰذا ہمارے ان حکمرانوں کی سمجھ بوجھ اور معاملہ فہمی تو اس راہ سے رخصت ہوئی۔ رہی ہمت و جرأت اور حوصلہ و ارادہ تو ان سب کا جنازہ بدکاریوں نے نکال دیا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف یہ کہ یہ لوگ خود بتاشے کی طرح بیٹھ گئے بلکہ ساتھ ہی ایک پوری قوم بلکہ روئے ارض کی پوری امت مسلمہ کی عزت و ناموس کا دھیلہ کر گئے۔

لیکن، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، یہ سب شکست کے صرف فوری اسباب ہیں اور اس بحر کی گہرائیوں میں ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کے مصداق تہہ بر تہہ تاریکیاں موجود ہیں اور صرف سطح آب پر چمکنے والی چیزوں پر نگاہ رکھنا اور گہرائیوں میں اتر کر حقائق کا مواجہہ کرنے سے گریز کرنا بھی من جملہ ان بیماریوں کے ہے جو ہمیں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔ اس لیے کہ یہ در حقیقت قومی سطح پر گریز اور فراریت کا وہ مرض ہے جس نے پوری قوم کا مزاج اس طرز پر ڈھال دیا ہے کہ ہر ناکامی اور ہر خرابی کی ساری ذمہ داری کسی ایک یا چند افراد یا کسی ایسے گروہ یا طبقے کے سر تھوپ کر پوری قوم اپنی جگہ مطمئن ہوجائے اور بڑی سے بڑی ناکامی پر نہ اس کا اجتماعی شعور بیدار ہو، نہ اسے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس و ادراک ہوسکے اور نہ ہی اس کے قومی ضمیر میں کوئی خلش یا چبھن پیدا ہو۔ اس صورت حال کی ذمہ داری سب سے بڑھ کر دانشوروں اور خصوصاً صحافیوں پر عائد ہوتی ہے کہ ان کا دماغ اور قلم اکثر و بیشتر قوم کے اجتماعی شعور کو تھپک تھپک کر اور لوریاں دے دے کر سلانے ہی کا کام کرتا ہے۔ اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ اس طبقے کے فہم و ادراک کے قصور کا نتیجہ ہے یا مصلحت بینی اور عافیت کوشی کا ثمرہ۔ اس لیے کہ اس دور میں اصل ''سلطانِ جائر'' عوام ہیں اور ان کے سامنے ''کلمۂ حق'' کہنا ''لانا ہے جوئے شیر کا!''

ہمارے نزدیک ہماری ذلت آمیز شکست کے متذکرہ بالا فوری اسباب اور سطحی سبب کے نیچے کے تہہ در تہہ اسباب میں سے پہلا سبب یہ ہے کہ نہ صرف اس جنگ بلکہ اس پورے قضیے میں ہمارا سرے سے کوئی اخلاقی موقف ہی موجود نہ تھا، بلکہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے انعقاد کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب بڑی دھاندلی اور صریح بد دیانتی پر مبنی تھا۔ نتیجتاً چاہے ہم خود اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے میں کتنے ہی کامیاب ہوگئے ہوں بہرحال پوری دنیا کے سامنے ہم بالکل ننگے (exposed) تھے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ دنیا میں جس کسی

نے بھی ہمارے ملٹری ایکشن کی کسی درجے میں مدافعت کی اسے کس قدر بوجھ اپنے ضمیر پر ڈالنا پڑا ہوگا۔ خود ہم اپنے موقف کی مدافعت میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہہ سکے وہ یہ تھی کہ اس حمام میں صرف ہم ہی

ننگے نہیں ہیں بلکہ ع
''ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند''

بھارت نے بھی تو کشمیر میں یہی کیا تھا اور خود روس بھی تو اپنے کئی حلیف ممالک میں یہی کچھ کرچکا ہے !
اس معاملے کا افسوس ناک ترین پہلو یہ ہے کہ اس مسئلے میں بعض ایسے لوگوں نے بھی نہ صرف یہ کہ حکومت وقت کی تائید کی اور اس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے بلکہ عملاً امداد اور تعاون کی روش اختیار کی اور ایک بد دیانت اور شرابی و زانی ٹولے کا آلۂ کار بننا قبول کرلیا جو اس ملک کے سیاسی میدان میں حق و صداقت کے سب سے بڑے علمبردار رہے ہیں اور جن کا سارا سیاسی کاروبار دین و مذہب کے نام پر چل رہا ہے۔ ہمارا دل اس تصور سے کانپ اٹھتا ہے کہ اگر ع
''قیاس کن زِگلستانِ من بہار مرا''

کے مصداق اسی واقعے کو ہماری قوم کی اخلاقی حس کو ماپنے کے لیے پیمانہ بنا لیا جائے تو نتیجہ کیا نکلے گا ! ظلم اور دھاندلی کے خلاف بولنے کی جرأت اور ہمت نہ ہو تو کم سے کم خاموش تو رہا جا سکتا ہے۔ یہ کتنی بڑی ابن الوقتی اور جواری پن ہے کہ انسان اپنے مفادات پر نگاہ رکھتے ہوئے اور ذاتی مواقع کے پیش نظر کسی ظالم کے ظلم میں اس کا ساجھی اور مددگار بن جائے۔ ہماری قوم کے اخلاقی دیوالیہ پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس دھاندلی کے آغاز میں تو مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کا لیڈر اس کا آلۂ کار بن گیا اور دوسرے مرحلے (phase) میں جب اس لیڈر کو ہوش آگیا اور اس نے دبی زبان سے ہی سہی ظلم کے خلاف کسی قدر بولنا شروع کیا تو اس ملک میں مذہب و سیاست کی سب سے بڑی علمبردار جماعت کو اس ظلم اور زیادتی کا آلہ کار بننے کا شرف حاصل ہوگیا۔
شکست کے اسباب و عوامل میں سے دوسرا گہرا سبب یہ ہے کہ ہم تاحال سیاسی اعتبار سے ایک ''نابالغ'' قوم ثابت ہوئے ہیں اور ہمارے یہاں جو ذمہ داریاں کسی قومی قیادت کو سنبھالنی چاہئیں تھیں ان کا بوجھ بھی فوج کو اٹھانا پڑا ہے۔ جدید دور کی ریاست (state) ایک بڑا عظیم اور ہمہ گیر ادارہ ہے اور اس میں مختلف ذمہ داریاں مختلف طبقوں کو اٹھانی پڑتی ہیں اور ع ''ہر کسے را بہر کارے ساختند'' کے مصداق ہر طبقے کو اپنی مخصوص ذمہ

داریوں کے لیے مناسب تربیت (training) دی جاتی ہے اور جس طرح ملک کے دفاع اور اس کی سرحدوں کا تحفظ نہ عوام کے بس کا ہے نہ سول انتظامیہ کے‘اسی طرح اہل سیاست کے حصے کا بوجھ نہ فوج اٹھا سکتی ہے نہ سولِ انتظامیہ۔ کسی قومی تنظیم اور قومی قیادت کے خلا کو کوئی دوسرا ادارہ پر نہیں کرسکتا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہماری حالیہ شکست قومی اور اجتماعی سطح پر ہماری مسلسل ناکامیوں (failures) اور درجہ بدرجہ پسپائی کا نقطہ عروج (climax) ہے اور بظاہر تو یہ نتیجہ ہے صرف ہماری فوج بلکہ صحیح تر الفاظ میں اس کی بھی صرف سابق عیاش اوربدکردار قیادت کے بودے پن کا‘لیکن درحقیقت یہ منطقی انتہا ہے ہمارے سیاسی دیوالیہ پن کی اور مظہر اتم ہے پوری پاکستانی قوم کی نا اہلیت اور ناقابلیت اور اجتماعی و سیاسی نابالغی کا !

جیسا کہ ہم نے جولائی ۱۹۶۹ء کے محولہ بالا ’’تذکرہ وتبصرہ‘‘ میں بھی عرض کیا تھا‘ پاکستان کی ربع صدی کی مختصر سی تاریخ کے ابتدائی گیارہ سالوں کے دوران‘یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک کے عرصے میں‘پاکستان کے سیاست دانوں کی نا اہلی و ناقابلیت کا تدریجی ظہور ہوا اور اس کے اختتام کے قریب قطعی طور پر ثابت ہوگیا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور شخصیتیں اس عظیم مملکت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں بالکل ناکام ہوچکی ہیں اور ان کے ہاتھوں اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے فطری نتیجے کے طورپر۱۹۵۸ ء میں ایک انقلاب آیا جو بظاہر اور ابتداءً تو فوجی تھا لیکن اس نے بہت جلد ایک سابق فوجی کے زیر سربراہی ایک خالص نوکر شاہی کی صورت اختیار کرلی اور اہل سیاست کو میدان سے ہٹا کر مملکت کے دوسرے منظم ادارے یعنی سول سروسز نے ملک کے نظم و نسق کو سنبھال لیا۔ چنانچہ دوسرا گیارہ سالہ دور جو ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۹ء تک جاری رہا درحقیقت بیوروکریسی کا دور تھا اور اس کے دوران قوم کے اس دوسرے طبقے کی بھی بھرپور آزمائش ہوگئی‘لیکن افسوس کہ اس دور کے بالکل ابتدا ہی سے ظاہر ہونا شروع ہوگیا تھا کہ قوم کا یہ طبقہ بھی دیانت و امانت اور احساسِ فرض کے ان اوصاف سے بہت حد تک عاری ہے جو اس عظیم ذمہ داری کو کماحقہ ادا کرنے کے لیے لازمی ہیں جو اس کے کندھوں پر آپڑی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس طبقے کی نا اہلیت بھی واضح ہوتی چلی گئی اور ۱۹۶۸ء کے اواخر میں بے اطمینانی کا وہ لاوا جو قوم کے مختلف طبقات میں اس طبقے کی دست درازیوں کے باعث کھول رہا تھا‘اچانک پھٹ پڑا اور اس طرح یہ دور بھی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوگیا۔

ان دونوں طبقات کی ناکامی کے بعد ملک و ملت کے پاس ایک ہی منظم ادارہ باقی رہ گیا ہے‘یعنی فوج۔ چنانچہ اب کی بار ایک خالص ’’جرنیلی حکومت‘‘قائم ہوئی اور فوج نے ملک کے پورے نظم و نسق کو سنبھالا۔ ہم نے اسی وقت عرض کردیا تھا کہ:

''اس ادارے کا اصل فریضہ دفاع وطن ہے اور یہ بجائے خود اتنی عظیم ذمہ داری ہے کہ اس پر کوئی مزید بوجھ ڈالنا حد درجہ نا انصافی ہے۔ بین الاقوامی حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کے پیش نظر مستقبل میں دفاعِ وطن کی ذمہ داری یقینا پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھاری اور بوجھل ہوجائے گی اور ڈیفنس سروسز کے کندھوں پر اگر زیادہ دیر تک ملک کے داخلی نظم و نسق کا بوجھ بھی پڑا رہا تو اس سے دفاعِ وطن کے محاذ کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اور یہ خطرہ اتنا بڑا ہے کہ اسے کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔''

اب اگر یہ ادارہ ان دو طرفہ ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے میں ناکام ہوا تو اس کا الزام جتنا اس کے سر آتا ہے اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ پوری قوم پر آتا ہے کہ اس نے اس پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ ڈالا ہی کیوں۔ لہٰذا سابق صدر یحییٰ خان اور ان کے رفقائے کار کی نا اہلیت کے پردے میں در اصل پوری قوم کی ناقابلیت کا ظہور ہوا ہے اور ان کی ناکامی اصلاً پوری قوم کی ناکامی ہے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ ارباب سیاست اور بیوروکریسی کی نا اہلیوں اور ناکامیوں کے نتائج صرف اندرون ملک بدانتظامی اور بے چینی و خلفشار تک محدود رہے تھے جبکہ فوج کی ناکامی نے ہماری خامیوں اور نا اہلیوں کا بھانڈا بین الاقوامی چوراہے میں پھوڑ کر رکھ دیا اور ہم اپنے قدیم دشمن کے ہاتھوں ایک شرم ناک شکست سے دوچار ہوگئے۔

مزید گہرائی میں اتر کر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پوری صورت حال کی تہہ میں در اصل وہی الجھاؤ (dilemma) کار فرما ہے جس کا ذکر ہم نے نومبر ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں شائع شدہ اپنی ایک تقریر میں کیا تھا۔ یعنی یہ کہ ایک طرف تو نہ پاکستان کے قیام کے لیے کوئی وجہ جواز مذہب کے سوا موجود ہے اور نہ ہماری قومیت کے لیے کوئی اساس دین کے سوا کسی چیز کو قرار دینا ممکن ہے۔ گویا کہ نظری اعتبار سے تو ہماری قومیت بھی صرف اور صرف اسلام ہے اور ہمارا وطن (۱)

بھی صرف اور صرف اسلام ہے لیکن دوسری طرف عملاً صورت حال یہ ہے کہ یہی چیزیں یہاں کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم کے حکم میں آگئی ہیں۔ اس لیے کہ قیام پاکستان کے وقت تو پھر بھی' چاہے ایک جذباتی اور سطحی سی نوعیت ہی کا سہی' بہرحال ایک ''جذبہ ملی'' ہمارے یہاں موجود تھا' لیکن بعد میں نہ صرف یہ کہ اسے غذا نہیں ملی بلکہ رفتہ رفتہ ان جڑوں ہی کو کھود ڈالا گیا جو اسے امکانی طور پر سینچ _____ (۱) ''اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے''

سکتی تھیں۔ نتیجتاً اس وقت ہم بحیثیت قوم فضا میں معلق ہیں اور باوجود اس کے کہ ہمارے نیچے ایک ایسا خطہ زمین موجود ہے جسے دنیا مغربی پاکستان کے نام سے جانتی ہے' حقیقت یہ ہے کہ ہماری قومیت کی کوئی بنیاد بالفعل موجود نہیں۔

اب ظاہر ہے کہ قومی وملی کردار اور سیاسی و اجتماعی شعور بہرحال کسی تصورِ قومیت ہی کی اساس پر وجود میں آسکتے ہیں اور کسی ملک کے رہنے والوں میں فکر کی کوئی ہم آہنگی' سوچ کی یکسانیت اور مقاصد کی یک جہتی کسی مشترک قومی جذبے ہی کی بنیاد پر پیدا ہو سکتی ہے' بلکہ خود انفرادی سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر کا انحصار بھی بہت حد تک اس اجتماعی شعور ہی پر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں' اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

تو بحالات موجودہ ہمارے اندر کوئی روح بیدار ہو تو کیسے؟ ہمارے قومی کرداری کی تعمیر ہو تو کس طرح اور ملک و ملت کے لیے قربانی اور ایثار کا جذبہ پروان چڑھے تو کس بنیاد پر؟ یہی اصل سبب ہے اس کا کہ نہ ہمارے اندر کوئی اجتماعی شعور بیدار ہوا نہ کوئی قومی نقطہ نظر پیدا ہوسکا' نہ کوئی قومی تنظیم وجود میں آسکی' نہ کوئی قومی قیادت ابھر سکی۔ نتیجتاً ناکامیوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ پہلے اہل سیاست ناکام ہوئے' پھر بیوروکریسی فیل ہوئی اور آخر کار فوج کی ناکامی کی صورت میں ہمارے قومی وقار کو وہ دھکا لگا جس کی یاد نسلوں تک باقی رہے گی اور جس کی تلافی خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کب اور کس صورت میں ممکن ہوسکے گی!

افسوس کہ گزشتہ تین مہینوں کے دوران جو حالات وواقعات رونما ہوئے انہوں نے ان دو نکات' یعنی ایک یہ کہ پاکستان کی بحیثیت ملک اور اس میں بسنے والوں کی بحیثیت قوم کوئی اساس اور بنیاد اسلام کے سوا موجود نہیں اور دوسرے یہ کہ یہی جنس اب یہاں عنقا کے حکم میں ہے' کو نہایت تلخ لیکن حد درجہ سنگین حقائق کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے لاکر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف ملک کے دو ٹکڑے ہوگئے اور ایک ''علاقائی قومیت'' نے پاکستانی قومیت کے تصور پر فتح حاصل کر لی۔ علیحدگی پسندی کے اس عمل کا آغاز تو فطری طور پر وہیں سے ہوا جہاں جغرافیائی فاصلے کی ایک اضافی پیچیدگی بھی موجود تھی لیکن خود مغربی پاکستان میں بھی یہ عمل اندر ہی اندر جاری ہے اور حقیقت بیں نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ مغربی پاکستان میں شمالاً جنوباً وہ دراڑ پڑ چکی ہے جو بڑھ کر کسی

خوف ناک کھائی میں تبدیل ہو سکتی ہے... اور دوسری طرف پاکستان کے دونوں خطوں میں وہ قیادتیں برسرکار آگئی ہیں جن کا اور چاہے کسی بھی چیز سے کتنا ہی مضبوط رشتہ کیوں نہ ہو' دین و مذہب سے بہرحال کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ ''بنگلہ دیش'' کی حکمران جماعت کے تو متعدد ذمہ دار لوگ کہہ ہی چکے ہیں کہ ہمارے تین بنیادی اصول وہی ہیں جن پر بھارت عمل پیرا ہے یعنی لادینیت' جمہوریت اور سوشلزم' بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ ''اگرچہ بنگلہ دیش مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا میں دوسرا سب سے بڑا ملک ہے تاہم ہم یہ پسند نہیں کریں گے کہ اسے ایک

مسلمان ملک کہا جائے'' اور ایک صاحب تو یہاں تک غزل سرا ہوئے ہیں کہ ''ہم بنگلہ دیش میں اسلام کو کچل کر رکھ دیں گے!'' وَقِسْ عَلٰی ھٰذَا۔ ادھر مغربی پاکستان میں بھی اب وہ قیادت برسر اقتدار آگئی ہے جو اس نظریئے کی حامل ہے جسے ہمارے ملک کے ایک صد و چودہ علماء کرام نے کفر قرار دیا تھا اور جو اگرچہ قولاً جمہوریت اور سوشلزم کے ساتھ اسلام کا پیوند بھی لگاتی ہے لیکن جس کی سیاست خالصتاً سیکولر اصولوں پر قائم ہے۔ چنانچہ وہ طریق انتخاب کے مسئلے میں کھلم کھلا جداگانہ کی بجائے مخلوط انتخابات کی حامی رہی ہے اور اگرچہ وہ اس امر کی مدعی ہے کہ ''اسلام ہمارا دین ہے'' تاہم اس سوال سے قطعاً بحث کرنے کو تیار نہیں کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم!

متذکرہ بالا مباحث سے راقم الحروف کے نزدیک تین اہم نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ اگرچہ ملکی اور ملی استحکام کے لیے کرنے کے کام بے شمار ہیں تاہم پاکستان کا اصل استحکام اور ملت اسلامیہ پاکستان کے اتحاد اور یکجہتی کا اصل دارومدار ''احیائے اسلام'' پر ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص صرف بعض سماجی برائیوں (social evils) مثلاً رشوت یا جہیز کی رسم ایسی چیزوں کے استیصال (eradication) کے لیے کوئی حقیقی اور واقعی محنت کرتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بھی یقیناً قومی تعمیر نو ہی کا ایک کام کر رہا ہے اور اسے ملک و ملت کے ہر بہی خواہ کی اشیرواد حاصل ہونی چاہیے' لیکن ع ''خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ'' کے مصداق پاکستان دنیا کا ایک ایسا انوکھا ملک ہے جس کی واحد اساس مذہب ہے اور اس میں بسنے والے لوگ دنیا کی وہ واحد قوم ہیں جن کی قومیت کی کوئی بنیاد مذہب کے سوا موجود نہیں۔ لہٰذا یہاں ملک اور ملت دونوں کا

استحکام' آخری تجزیے میں' صرف ایک ہی شے سے وابستہ ہے اور وہ ہے احیائے دین و مذہب۔

اور یہ' ایک اعتبار سے' ایک بہت بڑی خوش قسمتی بھی ہے اس لیے کہ انسان کو عقیدے' قومیت اور وطنیت کی ایسی ''وحدت'' شاذ ہی نصیب ہوتی ہے۔ ذرا ہندوستان کے کسی مسلمان کی حالت زار کو ذہن میں لائیے کہ وہ کیسے انتشارِ ذہنی اور خلفشارِ قلبی کا شکار ہے کہ اس کے دین و مذہب کے تقاضے اس کے دل و دماغ سے کچھ اور ہیں اور ملک و وطن کے تلخ حقائق اسے کسی اور جانب چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی عرب ملک کے دین دار مسلمان کا حال بھی یہ ہے کہ اس کا دین اسلام ہے' قومیت عربی اور وطنیت مصری یا سعودی یا اردنی۔ اس کے برعکس ایک پاکستانی مسلمان ہے کہ اس کا دین بھی اسلام' قومیت بھی اسلام اور وطن بھی اسلام۔

اس اعتبار سے حقیقت یہ ہے کہ میں خود اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا ہوں کہ جب میں احیائے دین کے لیے کسی حقیر سی خدمت میں اپنے آپ کو کھپا رہا ہوتا ہوں تو مجھے کامل اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ میں اپنے خالق و مالک کا حق بھی ادا کر رہا ہوں اور اپنی قوم اور ملک کا بھی۔ اس لیے کہ میری قوم کا اتحاد بھی

اصلاً اسی میں مضمر ہے اور ملک کے استحکام کا دارومدار بھی حقیقتاً اسی پر ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ ''احیائے اسلام'' اور ''احیائے دین و مذہب'' کا کام فی الوقت سیاسی میدان میں نہیں کیا جا سکتا بلکہ ابھی ایک عرصے تک اس غرض کے لیے پوری قوت تعلیم و تدریس اور فکر و ادب کے میدان میں کھپانی ہوگی اور توجہ کو معاشرتی اور سماجی دائروں میں مرتکز رکھنا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ کسی ملک کے سیاسی میدان میں صرف وہی اقدار بروئے کار آ سکتی ہیں جو فی الواقع معاشرے میں رچی بسی ہوئی ہوں اور لوگوں کے دل اور دماغ میں گہری جڑیں رکھتی ہوں۔ عوام کی سوچ کے زاویوں اور ان کی بنیادی اقدار کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں کسی انقلاب یا حقیقی تبدیلی کی توقع نہایت احمقانہ ہے۔ ادھر حال یہ ہے کہ فی الواقع ہمارے معاشرے میں دینی اقدار نہایت مضمحل بلکہ تقریباً مردہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چوبیس سالوں کے دوران اس ملک کی سیاسی فضا میں جو کام دین کے نام پر کیا گیا وہ قطعاً بے ثمر اور لاحاصل ثابت ہوا۔

دوسری جانب مندرجہ ذیل معروضی حقائق ہیں جن کی تفصیل میں جانا اس وقت ممکن نہیں:

(تفصیل کے لیے دیکھئے راقم کی تالیف ''استحکام پاکستان'')

(۱) ہماری ایک عظیم اکثریت کا دین و مذہب کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق نہیں!

(۲) مذہب کے متوسلین کی اکثریت کا تصورِ دین محدود بھی ہے اور مسخ شدہ بھی!

(۳) وسیع تر تصور کے حامل لوگوں کی اکثریت بھی بالکل بے عمل ہے!

(۴) فعال مذہبی عناصر کا مجموعی اثر و نفوذ بھی نہایت قلیل اور ناقابل شمار ہے!

یہ حقائق اگرچہ نہایت تلخ ہیں تاہم ہیں بالکل واقعی جن کا انکار سوائے ہٹ دھرمی اور بے جا ضد کے کسی طرح ممکن نہیں۔ تو سوچنا چاہیے کہ دین کے مستقبل سے حقیقی دلچسپی رکھنے والوں کا فی الوقت سیاسی میدان میں اپنی قوتوں کو ضائع کرتے رہنا آخر چہ سود؟

اس سے بھی بڑھ کر ہم چاہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے حق نصح کی ادائیگی کے طور پر یہ عرض کردیں گے کہ ملک کے سیاسی میدان میں اسلام کے نام پر جو کچھ ہوا اب تک تو وہ صرف لا حاصل اور بے کار ہی رہا ہے لیکن آئندہ انتہائی خطرناک بھی ہوسکتا ہے' اور اس وقت خود حکمت عملی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس میدان سے پسپائی اختیار کرکے پوری قوت کو تعلیم وتدریس اور ذہنی و فکری انقلاب پر مرکوز کردیا جائے! یہ بات ہم بہت پہلے سے کہہ رہے ہیں لیکن اکثر و بیشتر ہماری بات کو کسی ضد یا تعصب پر محمول کیا گیا لیکن اب حقائق تلخ ترین صورت میں سامنے آ چکے ہیں۔ کاش کہ اب بھی لوگ سوچنے پر آمادہ ہوجائیں اور ایک غلط میدان میں قوتوں کو ضائع کرتے رہنے سے باز آجائیں!

تیسرا نتیجہ جو در اصل دوسرے نتیجے ہی کی منطقی انتہا ہے' یہ ہے کہ چونکہ دین کا قصر بنیادوں تک منہدم ہوچکا ہے لہٰذا اس کی سرسری مرمت سے کام نہیں چل سکتا بلکہ ضرورت بنیاد سے از سرِ نو تعمیر کی ہے' یا بالفاظ دیگر یہ مرحلہ در حقیقت ''قیامِ نظامِ اسلامی'' کا نہیں بلکہ ''تجدید ایمان'' اور ''تعمیر یقین'' کا ہے اور ''احیائے اسلام'' کے لیے لازم ہے کہ پہلے پورے معاشرے میں ''احیائے ایمان'' کی ایک ہمہ گیر تحریک برپا ہوجائے اور ایمان و یقین کی روشنی سے ہمارا معاشرہ جگمگا اٹھے۔

اس مرحلے پر ایک نگاہ باز گشت اپنے معاشرے پر اس اعتبار سے دوبارہ ڈال لیجیے کہ اس کے مختلف طبقات میں ایمان اور یقین واقعتاً کس حال میں ہیں۔

ہماری رائے میں ایمان اور یقین کا جائزہ لینے کی غرض سے ہم اپنے معاشرے کو تین طبقات میں تقسیم کرسکتے ہیں:

سب سے بڑا طبقہ عوام الناس پر مشتمل ہے جن کے یہاں ایمان در حقیقت نام ہے چند موروثی عقائد کا جن کا ان کے فہم اور شعور سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ انہوں نے چند اعتقادات کو اپنے ذہن کے کسی گوشے میں بس رکھ تو لیا ہے لیکن ان کا کوئی لحاظ نہ رکھتے ہوئے زندگی کی عملی روش کو زمانے کے عام بہاؤ کے رخ پر ڈال دیا ہے ۔اس سے زیادہ کی ان سے توقع بھی فضول ہے۔

دوسرا بڑا اور اہم ترین طبقہ پڑھے لکھے' سمجھ دار اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ہے جن میں ڈاکٹر' انجینئر' وکلاء' سی ایس پی افسر' کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر بلکہ یونیورسٹیوں کی زیر تعلیم نسل بھی شامل ہے۔

اس طبقے کی اکثریت' حقیقت یہ ہے کہ خالص ملحد لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں سے اکثر ''خاموش ملحد'' ہیں اور اپنے الحاد کو زبان پر نہیں لاتے' اگرچہ ایک چھوٹی سی اقلیت ایسے نسبتاً زیادہ جری اور بے باک لوگوں کی بھی موجود ہے جو کھلم کھلا اپنے الحاد کا اقرار اور اعلان کرنے سے نہیں ہچکچاتے !

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جدید تعلیم یافتہ طبقے میں خاصی تعداد میں ایسے بھلے لوگ بھی موجود ہیں جو کم از کم ایک ثقافت کی حد تک اسلام کے دامن سے وابستہ ہیں اور کچھ نماز روزہ کرلیتے ہیں۔ تاہم زیادہ گہرے تجزیئے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بھی ایک عظیم اکثریت ذہنی و فکری اعتبار سے دوغلی شخصیت (split personality) کی حامل ہے اور انہوں نے اپنے دماغ کے ایک کونے میں مذہب اور اس کے معتقدات کو رکھ چھوڑا ہے جبکہ دوسرے خانے میں جدید افکار و نظریات کو' اور ان دونوں کو متضاد متصور کرتے ہوئے بھی بیک وقت قبول کر رکھا ہے۔

مثال کے طور پر جدید علم الحیات (Biology) جس شخص نے بھی پڑھا ہے وہ ڈارون کے نظریۂ

ارتقاء کو ایک واقعہ تصور کرنے پر مجبور ہے یا کم از کم اس کی تردید کے لیے کوئی تشفی بخش دلائل نہیں رکھتا۔ دوسری طرف عام خیال یہی ہے کہ یہ نظریہ قرآن حکیم کے نظریۂ تخلیق و ہبوطِ آدم کی عین ضد ہے۔ ہمارے ڈاکٹروں اور علم الحیوانات یا علم النباتات کے فارغ التحصیل

لوگوں میں بہت سے ایسے نیک سرشت لوگ بھی موجود ہیں جو ان دونوں کو بیک وقت مانتے بھی ہیں اور ساتھ ہی ان کے دلوں میں یہ چور بھی موجود ہے کہ ہیں یہ دونوں چیزیں باہم متضاد اور ایک دوسرے کی کامل ضد!

حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم کے طبقہ متوسط کے بہت سے دینی مزاج رکھنے والے لوگ جو فعال مذہبی جماعتوں سے بھی وابستہ ہیں' خود اس باطنی روگ کا شکار ہیں کہ ان کے اپنے دین و ایمان کو جدید علوم و فنون اور نظریات و افکار نے اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔

تیسرا طبقہ علماء کرام کا ہے۔ اس طبقے میں بلاشبہ کہیں کہیں علم و عرفان کی شمعیں روشن ہیں' لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس طبقے کی بھی اکثریت کا حال یہ ہے کہ اگرچہ ایمان کے اعلان میں سب سے زیادہ بلند و بانگ وہی ہیں لیکن عملی زندگی میں ان کی کیفیت خالص دنیا داری بلکہ دنیا پرستی کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ چنانچہ عوام الناس میں ایک کہاوت مشہور ہوچکی ہے کہ ''مولوی جو کہے اسے سن بھی لیا کرو اور حتی الامکان اس پر عمل کی کوشش بھی کرو لیکن جو کرے اسے دیکھا مت کرو۔'' یہ ہے حال ہمارے معاشرے کا ایمان اور یقین کے اعتبار سے!

چنانچہ ہمارے نزدیک تو ''کرنے کا اصل کام'' وہی ہے جو ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنے کتابچے ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ'' میں بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن حکیم کی روشنی میں وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر ایک ایسی زبردست فکری تحریک برپا کی جائے جو ایک طرف منفی طور پر جدید مادہ پرستانہ اور ملحدانہ افکار و نظریات کا مدلل ابطال کرے اور دوسری طرف مثبت طور پر معاشرے کے پڑھے لکھے اور ذہین طبقے (Intelligentsia) کے قلوب و اذہان میں ایمان اور یقین کی شمعیں روشن کردے۔ اس لیے کہ جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے' ان کے قلوب میں تو نورِ ایمان صرف اصحاب یقین کی صحبت سے بھی پیدا ہوسکتا ہے اور یہ کام ہمارے معاشرے میں اس گئے گزرے دور میں بھی کسی نہ کسی درجے میں ہورہا ہے' یعنی جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا' علماء کرام کے حلقوں میں کہیں کہیں علم و عرفان کی جو شمعیں روشن ہیں ان سے عوام الناس کی حد تک ماحول میں کچھ نہ کچھ نورِ ایمان سرایت کر ہی رہا ہے' لیکن متذکرہ بالا ذہین طبقہ اپنے ذہن کی ساخت اور مزاج کی افتاد کے اعتبار سے مجبوراً محتاج ہے کہ پہلے ان کے ذہن کی گرہیں کھولی جائیں' اور اسے گمراہ کن افکار و نظریات سے خلاصی دلائی جائے' تب ہی ان کے قلوب و اذہان ایمان اور یقین کی روشنی کو قبول کرنے کے

لیے تیار ہوسکیں گے ! اس موضوع پر ہم تفصیل کے ساتھ اپنے متذکرہ بالا کتابچے میں گزارشات پیش کرچکے ہیں۔
جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے ‘اس کا حال تو اس معاملے میں واقعتاً اب وہ ہوچکا ہے کہ ؎

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
اِلا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ زندگی کو تعلیم و تعلّم قرآن ہی میں صرف کردینے کی توفیق عطا کیے رکھے ! آمین۔